ماہنامہ

اشراق

لاہور

اکتوبر ۲۰۱۷ء

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

"ارتداد کی سزا کو بھی قانون اتمام حجت کے تناظر ہی میں سمجھا جانا چاہیے۔ ارتداد کی سزا کا تعلق عقیدے سے ہے، اور عقیدہ دل کا معاملہ ہے اور دل کی حالت پر اطلاع خدا کے سوا کسی کو نہیں اور خدا کی طرف سے اس دنیا میں اس کی اطلاع پانا رسول کے علاوہ کسی اور کے لیے ممکن نہیں ہے۔"

—— مقالات

"Note from Publisher: Al-Mawrid is the exclusive publisher of Ishraq. If anyone wishes to republish Ishraq in any format (including on any website), please contact the management of Al-Mawrid on info@al-mawrid.org. Currently, this journal or its contents can be uploaded exclusively on Al-Mawrid.org, JavedAhmadGhamidi.com and Ghamidi.net"

المورد

المورد

ادارۂ علم و تحقیق

المورد ملت اسلامیہ کی عظیم علمی روایات کا امین ایک منفرد ادارہ ہے۔ پندرھویں صدی ہجری کی ابتدا میں* یہ ادارہ اِس احساس کی بنا پر قائم کیا گیا ہے کہ تفقہ فی الدین کا عمل ملت میں صحیح نہج پر قائم نہیں رہا۔ فرقہ وارانہ تعصّبات اور سیاست کی حریفانہ کشمکش سے الگ رہ کر خالص قرآن وسنت کی بنیاد پر دین حق کی دعوت مسلمانوں کے لیے اجنبی ہو چکی ہے۔ قرآن مجید جو اِس دین کی بنیاد ہے، محض حفظ وتلاوت کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ دینی مدرسوں میں وہ علوم مقصود بالذات بن گئے ہیں جو زیادہ سے زیادہ قرآن مجید تک پہنچنے کا وسیلہ ہو سکتے تھے۔ حدیث، قرآن وسنت میں اپنی اساسات سے بے تعلق کر دی گئی ہے اور سارا زور کسی خاص مکتب فکر کے اصول وفروع اور دوسروں کے مقابلے میں اُن کی برتری ثابت کرنے پر ہے۔

المورد کے نام سے یہ ادارہ اِس صورت حال کی اصلاح کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ چنانچہ اِس ادارے کا بنیادی مقصد دین کے صحیح فکر کی تحقیق وتنقید، تمام ممکن ذرائع سے وسیع پیمانے پر اُس کی نشرواشاعت اور اُس کے مطابق لوگوں کی تعلیم وتربیت کا اہتمام ہے۔

اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے، اُس کے اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ عالمی سطح پر تذکیر بالقرآن کا اہتمام کیا جائے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۲۔ قرآن وسنت کے مطابق خدا کی شریعت اور ایمان واخلاق کی تعلیم دی جائے۔

۳۔ دین کے صحیح الفکر علما اور محققین کو فیلو کی حیثیت سے ادارے کے ساتھ متعلق کیا جائے اور اُن کے علمی، تحقیقی اور دعوتی کاموں کے لیے اُنھیں ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں۔

۴۔ لوگوں کو آمادہ کیا جائے کہ جہاں جہاں ممکن ہے:

ا۔ اسلامی علوم کی ایسی درس گاہیں قائم کریں جن کا مقصد دین کے صحیح الفکر علما اور محققین تیار کرنا ہو۔

ب۔ ایف اے، ایف ایس سی اور اے لیول تک نہایت اعلیٰ معیار کے اسکول قائم کریں جن میں تعلیم وتعلم کے ساتھ طالب علموں کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشوونما اور اُن کی دینی اور تہذیبی تربیت بھی پیش نظر ہو۔

ج۔ عام اسکولوں کے طلبہ کی دینی تعلیم کے لیے ایسے ہفتہ وار مدارس قائم کریں جن میں قرآن کی دعوت خود قرآن ہی کے ذریعے سے طالب علموں کے ذہن میں اِس طرح راسخ کر دی جائے کہ بعد کے زمانوں میں وہ پورے شرح صدر کے ساتھ اپنے دین پر قائم رہ سکیں۔

د۔ ایسی خانقاہیں قائم کریں جہاں لوگ وقتاً فوقتاً اپنے دنیوی معمولات کو چھوڑ کر آئیں، علما وصالحین کی صحبت سے مستفید ہوں، اُن سے دین سیکھیں اور چند روز کے لیے یک سوئی کے ساتھ ذکر وعبادت میں مشغول رہ کر اپنے لیے پاکیزگیِ قلب و نظر کا اہتمام کریں۔

---

* شعبان ۱۴۰۳ھ بمطابق جون ۱۹۸۳ء۔

ماہنامہ
اشراق
لاہور

جلد ۲۹ شمارہ ۱۰ اکتوبر ۲۰۱۷ء محرم الحرام/صفر المظفر ۱۴۳۹ھ

زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی

مدیر
سید منظور الحسن

فہرست

شذرات
مصوری کی حرمت کے استدلال کا جائزہ — سید منظور الحسن — ۴

قرآنیات
البیان: الکہف ۱۸: ۸۳-۹۸ (۶) — جاوید احمد غامدی — ۱۳

سیر و سوانح
حضرت فاطمہ بنت خطاب رضی اللہ عنہا — محمد وسیم اختر مفتی — ۲۱

مقالات
قانونِ اتمامِ حجت اور اس کے اطلاقات نمایاں اعتراضات کا جائزہ (۶) — ڈاکٹر عرفان شہزاد — ۲۵

نقطۂ نظر
کیا انسان اللہ کا خلیفہ ہے: ایک قرآنی مطالعہ — ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی — ۴۶

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

فی شمارہ 30 روپے
سالانہ 300 روپے
رجسٹرڈ 700 روپے
(زرتعاون بذریعہ منی آرڈر)

بیرون ملک
سالانہ 30 ڈالر

Post Box 5185, Lahore, Pakistan.
www.ghamidi.net, www.javedahmadghamidi.com
https://www.facebook.com/javedahmadghamidi
http://www.javedahmadghamidi.com/index.php/ishraq

شذرات

سید منظور الحسن

مصوری کی حرمت کے استدلال کا جائزہ

مصوری کے حوالے سے ہمارے فقہا کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جان دار مخلوقات کی تصاویر حرام اور بے جان مخلوقات کی جائز ہیں۔ اس نقطۂ نظر کی اساس وہ روایتیں ہیں جن میں اللہ کی مخلوق جیسی مخلوق بنانے کی مذمت کی گئی ہے اور ایسی چیزوں کی تصویر بنانے سے منع کیا گیا ہے جن میں روح پائی جاتی ہے۔ اس ضمن میں فقہ کی کتابوں سے چند نمایندہ اقتباسات حسب ذیل ہیں:

قال أصحابنا و غيرهم: تصوير صورة الحيوان حرام أشد التحريم و هو من الكبائر وسواء صنعه لما يمتهن أو لغيره فحرام بكل حال لأن فيه مضاهاة لخلق الله وسواء كان في ثوب أو بساط أو دينار أو درهم أو فلس أو إناء أو حائط و أما ما ليس فيه صورة حيوان كالشجر و نحوه، فليس بحرام و سواء كان في هذا كله ما له ظل و ما لا ظل له و بمعناه. قال جماعة العلماء مالك و الثوري و أبو حنيفة و غيرهم و قال القاضي: إلا ما ورد في لعب البنات و كان مالك يكره شراء ذلك.

(عمدۃ القاری ۲۲/ ۷۰)

''ہمارے اصحاب (فقہاے احناف) اور ان کے علاوہ دوسرے فقہا کہتے ہیں کہ جان دار کی تصویر بالکل حرام ہے۔ اسے بنانا کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ یہ حرمت ہر صورت میں ہے، خواہ تصویر اہانت کے مقام پر رکھنے کے لیے بنائی گئی ہو یا عظمت کے مقام پر رکھنے کے لیے، کیونکہ اس میں خدا کی تخلیق کی مشابہت پائی جاتی ہے۔ یہ تصویر خواہ کسی کپڑے، بچھونے، دینار، درہم، پیسے، برتن یا دیوار پر بنی ہو، حرمت میں سب برابر ہیں۔ البتہ اگر اس تصویر

میں کسی جان دار کی شکل نہ ہو تو پھر یہ حرام نہیں ہے۔ (جو تصاویر حرام ہیں، ان میں) حرمت کا معاملہ یکساں ہو گا، خواہ وہ مجسمہ ہوں جس کا سایہ ہو سکتا ہے یا ایسی تصاویر ہوں جن کا سایہ ہو ہی نہیں سکتا۔ تصویر کے معاملے میں یہی راے علما کی اس جماعت کی بھی ہے جس میں امام مالک، سفیان ثوری، امام ابوحنیفہ اور دوسرے علما شامل ہیں۔ البتہ قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ لڑکیوں کی گڑیاں اس سے مستثنیٰ ہیں۔ جب کہ امام مالک رحمہ اللہ ان کی خرید و فروخت کو بھی مکروہ سمجھتے تھے۔''

وقالوا: كره عليه السلام ما كان سترًا ولم يكره ما يداس عليه ويوطأ بهذا، قال سعد بن أبي وقاص وسالم وعروة وابن سيرين وعطاء وعكرمة: قال عكرمة: يوطأ من الصورة هو ذل لها وهذا أوسط المذاهب وبه قال مالك والثورى وأبو حنيفة والشافعي.

(عمدۃ القاری ۱۰/ ۳۱۳)

''حضرات صحابہ و تابعین نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تصاویر کو ناپسند کیا ہے جو پردہ کی صورت میں (معلق اور کھڑی) ہوں اور ان تصاویر کو ناپسند نہیں کیا جو پامال ہوں اور ان پر بیٹھا یا لیٹا جائے۔ یہی قول حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت سالم بن عبد اللہ اور عروہ اور ابن سیرین کا اور حضرت عطاء اور عکرمہ کا ہے۔ عکرمہ نے فرمایا کہ جو تصاویر پاؤں میں روندی جائیں، یہ ان کی ذلت ہے۔ یہ راے سب سے بہتر اور معتدل ہے۔ یہی مذہب امام مالک، سفیان ثوری اور ابوحنیفہ و شافعی کا ہے۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

قال أصحابنا وغيرهم من العلماء: تصوير صورة الحيوان حرام شديد التحريم وهو من الكبائر لأنه متوعد عليه بهذا الوعيد الشديد المذكور في الأحاديث وسواء صنعه بما يمتهن أو بغيره فصنعته حرام بكل حال لأن فيه مضاهاة بخلق اللّٰه تعالى وسواء ما كان في ثوب أو بساط أو درهم أو دينار أو فلس أو إناء أو حائط أو غيرها وأما تصوير صورة الشجر ورحال الإبل وغيره ذلك مما ليس فيه صورة حيوان فليس بحرام هذا حكم نفس التصوير وأما اتخاذ المصور فيه صورة حيوان فإن كان معلقًا على حائط أو ثوبًا ملبوسًا أو عمامة ونحو ذلك مما لا يعد ممتهنا فهو حرام وإن كان في بساط يداس ومخدة ووسادة نحوها مما يمتهن فليس بحرام ولا فرق في هذا كله بين ماله ظل و ما لا ظل له، هذا تلخيص مذهبنا في المسئلة وبمعناه قال جماهير العلماء من الصحابة والتابعين ومن بعدهم وهو مذهب الثوري ومالك وأبي حنيفة وغيرهم.

(نووی مع مسلم ۲/ ۱۹۹)

''ہمارے (مسلک شافعی کے) فقہا اور ان کے علاوہ دوسرے علما فرماتے ہیں کہ جان دار کی تصویر بالکل حرام ہے اور یہ کبیرہ گناہوں میں سے ہے، کیونکہ اس پر وہ وعید شدید وارد ہوئی ہے جو احادیث میں آئی ہے۔ یہ حرمت ہر صورت میں ہے، خواہ تصویر توہین کے مقام پر رکھنے کے لیے بنائی گئی ہو یا شرف کے مقام پر رکھنے کے لیے، کیونکہ اس میں خدا کی تخلیق کی مشابہت پائی جاتی ہے۔ یہ تصویر خواہ کسی کپڑے، بچھونے، درہم، دینار، پیسے، برتن، دیوار یا کسی اور چیز پر بنی ہو، حرمت میں سب برابر ہیں اور جہاں تک درخت کی یا پالان کی یا ایسی ہی دوسری اشیا کی تصاویر کا تعلق ہے، جن میں روح نہیں ہوتی، تو وہ تصاویر حرام نہیں ہیں۔ یہ حکم تو تصویر بنانے کے بارے میں ہے۔ جہاں تک اس چیز کے استعمال کا تعلق ہے، جس پر کسی جان دار کی تصویر بنی ہو، وہ شے اگر دیوار پر معلق ہے یا وہ پہنا ہوا لباس ہے یا عمامہ ہے یا اس کی مثل کوئی اور ایسی چیز ہے، جو عموماً ذلیل وحقیر نہیں سمجھی جاتی، تو اس چیز کا استعمال حرام ہے۔ اور اگر جان دار کی یہ تصویر کسی بچھونے پر ہے جسے روندا جاتا ہے یا گدے اور تکیے پر یا اس کی مثل کسی ایسی چیز پر ہو جو عموماً پامال ہوتی ہے، تو اس چیز کا استعمال حرام نہیں اور ان سب تصاویر میں اس پہلو سے کوئی فرق نہیں کہ وہ مجسم ہوں جن کا سایہ پڑتا ہے یا وہ محض رنگ ونقش ہوں، جن کا سایہ نہیں ہوتا۔ تصویر کے معاملے میں یہ ہمارے مذہب کا خلاصہ ہے۔ اسی کی مثل صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین رحمہم اللہ اور مابعد کے اکثر علما کی رائے ہے۔ امام ثوری، امام مالک، امام ابوحنیفہ اور ان کے علاوہ دوسرے علما کا مذہب بھی یہی ہے۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

فقہا کے درج بالا نقطہ ہاے نظر کا خلاصہ نکات کی صورت میں حسب ذیل ہے:

- جان دار مخلوقات، مثلاً انسان یا حیوان کی تصویر حرام ہے اور اسے بنانا گناہ کبیرہ ہے۔
- یہ حرمت ہر صورت میں ہے، خواہ تصویر مجسم ہو یا کسی چیز پر نقش ہو۔
- یہ حرمت ہر حال میں ہے، خواہ تصویر محل عظمت میں ہو یا محل اہانت میں۔
- بے جان اشیا، مثلاً درخت یا پہاڑ کی تصویر جائز ہے اور اسے بنانے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

بعض فقہا کے نزدیک جان دار تصویروں کی حرمت سے دو طرح کی تصویریں مستثنیٰ ہیں:

ایک وہ جو محل اہانت میں پامال ہوں۔

دوسری وہ جو کھلونوں اور گڑیوں کی صورت میں بچوں کے کھیلنے کے لیے استعمال ہوں۔

جان دار کی تصویروں کی حرمت کے حوالے سے فقہا کے استدلال کا زیادہ تر انحصار ان روایتوں پر ہے جن میں یہ باتیں بیان ہوئی ہیں[1]:

---

[1] یہ روایتیں ''احادیث اور مصوری کی شناعت'' کے تحت زیر بحث آچکی ہیں، یہاں ان کا بیان محض علما کے استدلال کی تنقیح کے حوالے

۱۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو میرے مخلوقات بنانے کی طرح مخلوق بنانے نکل کھڑا ہو۔

۲۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو لوگ یہ تصویریں بناتے ہیں، ان سے کہا جائے گا کہ انھیں زندہ کرکے دکھاؤ۔

۳۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس نے تصویر بنائی، اس کو عذاب دیا جائے گا اور اس سے کہا جائے گا کہ اس میں روح پھونکو۔ چنانچہ ایک مصور کے استفسار پر حضرت ابن عباس نے اس فرمان نبی کی روشنی میں اس کو نصیحت کی کہ اگر تجھے تصویر بنانی ہی ہے تو درخت کی بنالے، ایسی چیز کی تصویر نہ بنا جس میں روح ہوتی ہے۔

ان روایتوں کی بنا پر یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ جان دار کی تصویر حرام ہے۔ ہمارے نزدیک ان روایتوں سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست نہیں ہے۔ روایتوں کا پس منظر اور ان کے متون یہ نتیجہ اخذ کرنے میں مانع ہیں۔ جہاں تک پس منظر کا تعلق ہے تو اس کے حوالے سے مختلف تفصیلات ہم نے ''احادیث اور مصوری کی شناعت'' کے زیر عنوان گذشتہ بحث میں نقل کر دی ہیں۔ ان کے تناظر میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ چونکہ عرب مصور بتوں اور ان کی تصویروں کو بے روح قالب کے طور پر نہیں، بلکہ زندہ وجود کے طور پر بناتے اور ان میں روحوں کے حلول کے قائل تھے، اس لیے انھیں بطور تنبیہ یہ کہا گیا کہ جن جمادات کو تم زندہ اور حامل روح خیال کرتے ہو، قیامت میں تمھیں سزا کے طور پر ان کو زندہ کرکے دکھانے اور ان کے جسد میں روح پھونکنے کا حکم دیا جائے گا۔[۲]

یہاں ہم مختصر طور پر یہ بیان کریں گے کہ مذکورہ روایتوں کے متون کس طرح یہ نتیجہ اخذ کرنے میں مانع ہیں کہ جان دار کی تصویر حرام ہے۔

ایک روایت یہ ہے:

سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: "قال الله عزوجل: ومن أظلم ممن ذهب يخلق خلقًا كخلقي. فليخلقوا ذرة أو ليخلقوا حبة أو ليخلقوا شعيرة". (مسلم، رقم ۲۱۱۱)

''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا، جو میرے مخلوق بنانے کی طرح مخلوق بنانے نکل کھڑا ہوا۔ (ایسی جسارت کرنے والوں کو چاہیے کہ) وہ ایک ذرہ تو تخلیق کرکے دکھائیں یا گندم یا جو کا

سے ہے۔

۲؎ اس نقطۂ نظر پر بحث ''احادیث اور مصوری کی شناعت'' کے زیر عنوان تمہید اور ابتدائی روایتوں کے تحت کی گئی ہے۔

ایک دانہ ہی تخلیق کر کے دکھا دیں۔‘‘

ہمارے نزدیک اس روایت سے حسب ذیل پہلوؤں کی وجہ سے جان دار کی تصویر کی حرمت کا مفہوم اخذ نہیں کیا جاسکتا:

اولاً، اللہ کی مخلوق جیسی مخلوق بنانے کے الفاظ کا مصداق تصویر کو ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کسی انسان کے مجسمے، شبیہ یا تصویر کو انسان کا عکس یا نقش تو کہا جا سکتا ہے، مگر اس کے مانند مخلوق نہیں کہا جا سکتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انسان جیسی مخلوق بنانے سے مراد یہ ہے کہ ایک ایسا وجود بنایا جائے جو گوشت پوست سے بنا ہو، متحرک ہو، کھاتا پیتا، جیتا جاگتا، سنتا بولتا ہو اور ارادہ و اختیار کا مالک ہو۔ یہ خصائص چونکہ ادنیٰ درجے میں بھی کسی تصویر یا مجسمے میں نہیں ہوتے، اس لیے اسے کسی طرح بھی اللہ کی مخلوق جیسی مخلوق بنانے سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ ’يخلق خلقًا كخلق‘ کے الفاظ سے جان دار کی تصویر مراد لینا تو دور کی بات ہے، تصویر مراد لینا بھی مشکل ہے۔

ثانیاً، بر سبیل تنزل اگر ان الفاظ سے تصویر کا مفہوم مراد لے بھی لیا جائے، تب بھی جان دار کی تخصیص تو کسی حال میں نہیں ہو سکتی۔ اس کی وجہ یہ بدیہی حقیقت ہے کہ لفظ ’مخلوق‘ کا اطلاق جس طرح جان دار اشیا پر ہوتا ہے، اسی طرح بے جان اشیا پر بھی ہوتا ہے۔ انسان اور حیوان کو بھی اللہ نے تخلیق کیا ہے اور شجر و حجر بھی اللہ کی مخلوق ہیں۔ یعنی جمادات اور نباتات میں سے کسی چیز کو اللہ کی مخلوق کے زمرے سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مزید برآں ’يخلق خلقًا كخلق‘ کے دائرے سے جمادات، یعنی بے جان چیزوں کو خارج کرنے میں اسی روایت کے یہ الفاظ حارج ہیں: ’فليخلقوا ذرة أو ليخلقوا حبة أو ليخلقوا شعيرة‘ ’’وہ ایک ذرہ تو تخلیق کر کے دکھائیں یا ایک دانہ یا ایک جو ہی تخلیق کر کے دکھا دیں‘‘۔ یہاں ذرے، دانے اور جو کا ذکر اللہ کی تخلیق کے طور پر آیا ہے اور یہ چیلنج کیا گیا ہے کہ اگر تخلیق کرنے کا دعویٰ رکھتے ہو تو اللہ کی ان نہایت چھوٹی مخلوقات کو تو بنا کر دکھاؤ۔ یعنی اگر تم ’يخلق خلقًا كخلقي‘ کے مصداق انسانوں اور حیوانوں جیسی میری عظیم الشان مخلوقات بنانے کے دعوے دار ہو تو میری ہی بنائی ہوئی چند چھوٹی مخلوقات، مثلاً مٹی کا ذرہ اور اناج کا دانہ ہی بنا کر دکھاؤ۔ گویا ذرہ، دانہ اور جو بنانا ’يخلق خلقًا كخلقي‘ کا عین مصداق ہے۔ یہ تینوں اشیا، ظاہر ہے کہ بے روح ہیں اور من جملۂ حیوانات نہیں ہیں۔ چنانچہ یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ روایت کے اپنے الفاظ جان دار کی تخصیص کرنے میں مانع ہیں، بلکہ اگر کوئی شخص اس روایت سے تخصیص کا حکم نکالنا بھی چاہے تو اسے جان دار کی نہیں، بلکہ ان تین مثالوں کی بنا پر بے جان کی تخصیص کرنی ہو گی۔

دومزید روایتیں یہ ہیں:

عن عائشة... فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "إن أصحاب هذه الصور يعذبون ويقال لهم أحيوا ما خلقتم". (مسلم، رقم ۲۱۰۷)

''سیدہ عائشہ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان تصاویر والوں کو عذاب دیا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ جو کچھ تم نے تخلیق کیا ہے، اسے زندہ کرو۔''

عن سعيد بن أبي الحسن قال: كنت عند ابن عباس رضي الله عنهما أتاه رجل فقال: يا أبا عباس، إني إنسان إنما معيشتي من صنعة يدي وإني أصنع هذه التصاوير، فقال ابن عباس: لا أحدثك إلا ما سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول، سمعته يقول: "من صور صورة فإن الله معذبه حتى ينفخ فيها الروح وليس بنافخ فيها أبدًا" فربا الرجل ربوة شديدة وأصفر وجهه، فقال: ويحك إن أبيت إلا أن تصنع فعليك بهذا الشجر كل شيء ليس فيه روح. (بخاری، رقم ۲۲۲۵)

''سعید بن ابی الحسن بیان کرتے ہیں کہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھا تھا کہ آپ کے پاس ایک آدمی آیا۔ اس نے کہا: اے ابن عباس، میں ایک ایسا آدمی ہوں جسے بس اپنے ہاتھ کے ہنر ہی سے روزی کمانی ہے۔ اور میں یہ تصاویر بناتا ہوں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں اس ضمن میں تم سے وہی بات بیان کرتا ہوں جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے۔ میں نے آپ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جس نے کوئی تصویر بنائی، اللہ اس کو لازماً عذاب دے گا، یہاں تک کہ اس سے کہا جائے گا کہ اس تصویر میں روح پھونکو، لیکن وہ اس میں کبھی روح نہ پھونک سکے گا۔ وہ شخص یہ سن کر ششدر رہ گیا اور اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے (یہ دیکھ کر) کہا: تیرا ناس ہو، اگر تجھے ضرور تصویر بنانی ہے تو تو اس درخت کی بنا لے، تصویر بس اسی چیز کی بنایا کر جس میں روح نہیں ہوتی۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ہمارے نزدیک ان روایتوں سے بھی جان دار کی تصویر کی حرمت کا مفہوم اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے وجوہ حسب ذیل ہیں:

اولاً، اگر ان روایتوں کے الفاظ پر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان میں جان دار یا بے جان کا مسئلہ

سرے سے زیر بحث ہی نہیں ہے۔ اس کے بجاے یہاں حامل روح ہونے یا نہ ہونے، یعنی زندہ ہونے یا نہ ہونے کی بات ہو رہی ہے۔ 'یقال لهم أحیوا ما خلقتم'' ''ان سے کہا جائے گا کہ جو تم نے بنایا ہے، اسے زندہ کرو'، 'حتی ینفخ فیها الروح و لیس بنافخ فیها أبدًا'' ''حتیٰ کہ اس سے کہا جائے گا کہ اس تصویر میں روح پھونکو، لیکن وہ اس میں کبھی روح نہ پھونک سکے گا'' کے جملے اسی حقیقت کو واضح کر رہے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جو لوگ بے روح جمادات کو مورتوں میں تشکیل دے کر ان میں فرشتوں، جنوں اور انسانوں کی روحیں ڈالنے کے زعم میں مبتلا ہیں، قیامت میں اللہ انھیں چیلنج کرے گا کہ ان میں فی الواقع روحیں ڈال کر دکھاؤ۔ گویا کہ اللہ فرمائے گا کہ میں نے مخلوقات کے اجسام بنائے، پھر ان میں روح پھونکی، پھر ان پر موت طاری کی اور ان کی روح قبض کی اور اب روز قیامت ان کے مردہ اجسام کو دوبارہ کھڑا کر کے ان میں از سر نو روح ڈالی ہے اور انھیں ایک مرتبہ پھر مردہ سے زندہ میں تبدیل کر دیا ہے۔ تم بھی دنیا میں اس امر کا دعویٰ کرتے رہے ہو، اب یہ لکڑی، مٹی، پتھر اور سونے چاندی کی مورتیں تمھارے سامنے مردہ پڑی ہیں۔ اگر تمھارے دعوے میں حقیقت ہے تو ان میں روح پھونکو اور انھیں زندہ کر کے دکھاؤ۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

بخاری کی روایت میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کے الفاظ بھی اسی بات کی تصدیق کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا ہے: 'إلا أن تصنع فعلیك بهذا الشجر کل شيء لیس فیه روح'' ''اگر تجھے ضرور تصویر بنانی ہے تو تو اس درخت کی بنا لے، تصویر بس اسی چیز کی بنایا کر جس میں روح نہیں ہوتی۔'' یعنی انھوں نے مصور کو سمجھایا ہے کہ جمادات میں سے جن اشیا کے ساتھ روح کا تصور وابستہ ہے، ان کی تصویریں نہ بنایا کر۔ جملے کے در و بست اور انتخاب الفاظ کی بنا پر قرین قیاس یہی ہے کہ سیدنا ابن عباس کے پیش نظر یہاں جان داروں، یعنی حیوانات کا تذکرہ پیش نظر ہی نہیں ہے۔ اگر سیدنا ابن عباس کے پیش نظر یہی بات ہوتی تو وہ 'إلا أن تصنع فعلیك بهذا الشجر کل شيء لیس فیه روح' کے بجاے 'إلا أن تصنع فعلیك بهذا الشجر کل شيء لیس بحیوان' کے الفاظ استعمال کرتے۔ عربی زبان میں بالعموم جان دار کے لیے حیوان اور بے جان کے لیے غیر حیوان یا جماد کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ فقہا کے درج بالا اقتباسات میں بھی جان دار اور بے جان کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے حیوان اور غیر حیوان کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ مزید برآں حیوان، یعنی جان دار کا تصور اگر ذہن میں ہو تو اس کے لیے لفظ 'شيء' بالعموم استعمال نہیں ہوتا۔ درخت کی مثال بھی اسی بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے، یعنی انھوں نے کہا کہ اس درخت کی یا جمادات و نباتات میں سے ایسی چیز کی تصویر تو بنا لیا کر و جس میں روح متصور نہیں ہوتی، مگر ایسے

جمادات کی تصویر نہ بنایا کرو جس میں روح متصور ہوتی ہے، جیسا کہ لات، منات اور عزیٰ کی پتھروں سے بنی ہوئی مورتیاں ہیں۔

ثانیاً، بخاری کی روایت کے وہ الفاظ جن پر مصور اور سیدنا ابن عباس کا پورا مکالمہ مبنی ہے، وہ یہ ہیں: 'إني أصنع هذه التصاوير' ''میں یہ تصاویر بناتا ہوں''۔ یہاں 'هذه' کا اسم اشارہ جن سامنے پڑی ہوئی تصاویر کی طرف ہے، انھی کے حوالے سے سیدنا ابن عباس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قول بیان کیا ہے اور انھی کے بنانے سے مصور کو منع کیا ہے۔ گویا اگر یہ متعین ہو جائے کہ وہ سامنے پڑی ہوئی تصاویر کون سی ہیں جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے تو روایت کے مدعا کو سمجھنے میں آسانی ہو سکتی ہے۔ ہمارے نزدیک ان الفاظ کو اگر روایت کے آخری الفاظ 'إلا أن تصنع فعليك بهذا الشجر كل شيء ليس فيه روح' ''اگر تجھے ضرور تصویر بنانی ہے تو اس درخت کی بنا لے، ہر اس چیز کی تصویر بنا لے جس میں روح نہیں ہوتی'' کی روشنی میں سمجھا جائے تو یہ بات بہت حد تک متعین ہو جاتی ہے کہ 'هذه التصاوير' سے مراد وہ تصویریں ہیں جو 'ليس فيه روح' کے متضاد الفاظ 'كل شيء فيه روح' کا مصداق ہیں، یعنی وہ تصویریں مراد ہیں جن میں روح ہوتی ہے۔ مشرکین عرب کے نزدیک روح کی حامل تصاویر وہی تھیں جو لات، منات، عزیٰ اور دوسرے ناموں سے موسوم تھیں اور جن کے اندر روحیں تصور کی جاتی تھیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

Selected Essays of Javed Ahmad Ghamidi

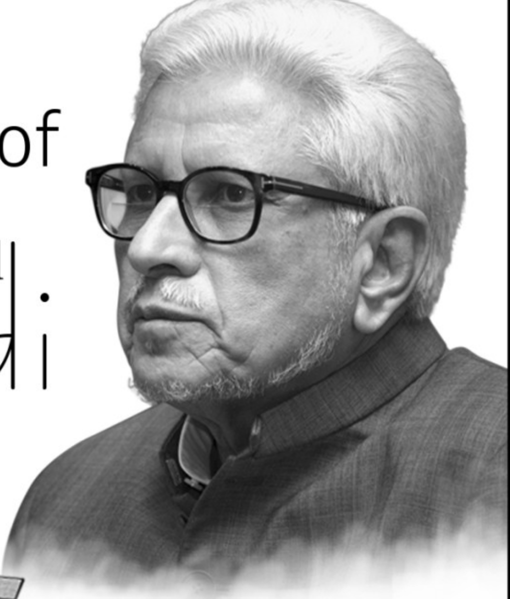

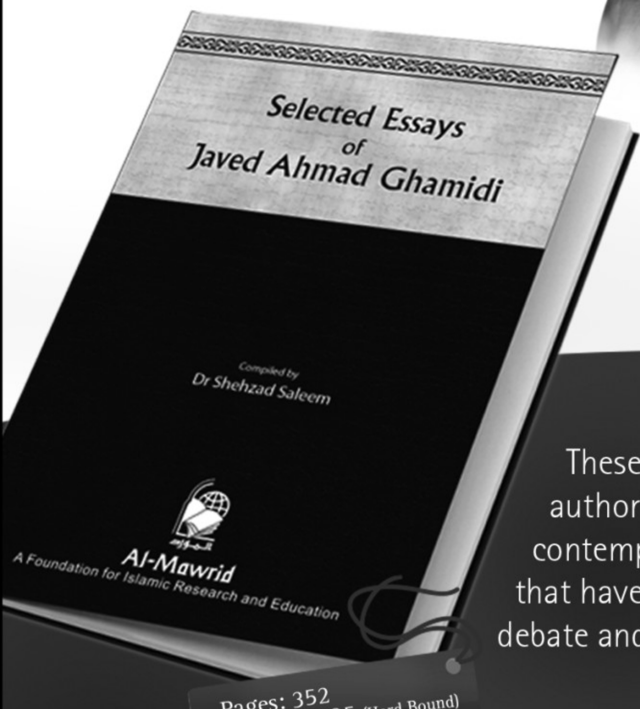

These translated essays reflect the author's views on some very important contemporary as well as age-old issues that have continued to be a cause of debate and controversy in academic circles.

المورد
Al-Mawrid

المورد
ادارۂ علم و تحقیق

For ordering our books, CDs and DVDs, please send us email at **info@al-mawrid.org**

www.al-mawrid.org

قرآنیات

البیان
جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورة الکهف

(۶)

(گذشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ﴿۸۳﴾ اِنَّا مَكَّنَّا

وہ تم سے ذوالقرنین[۸۶] کے بارے میں بھی پوچھ رہے ہیں۔ اِن سے کہو، میں اُس کا کچھ تذکرہ ابھی تمھیں

۸۶۔ اِس کے لفظی معنی ہیں: دوسینگوں والا۔ یہاں اِس سے مراد غالباً قدیم ایرانی بادشاہ خسرو (Cyrus) ہے۔ اُس کا اصل نام کورش تھا۔ وہ چھٹی صدی قبل مسیح میں اپنے والد کمبوچیہ کی چھوٹی سی ریاست اَنشان کا والی مقرر ہوا۔ برسراقتدار آتے ہی اُس کو مادا کے حکمران کے حملے کا مقابلہ کرنا پڑا جس میں اُس کو فتح حاصل ہوئی۔ اُس کے بعد فتوحات کا سلسلہ شروع ہو گیا اور چند ہی برسوں میں اُس نے وقت کی تمام بڑی ریاستوں کو زیرنگیں کر لیا اور اُس کی سلطنت بتدریج دنیا کے دونوں کناروں (مشرق و مغرب) تک پھیل گئی۔ چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ اُس وقت کی پوری مہذب دنیا عملاً اُس کی تابع فرمان تھی۔ اِس سے پہلے اِس سے زیادہ وسیع اور پرشکوہ سلطنت کوئی اور قائم نہیں ہوئی تھی۔

وہ ایک صاحب ایمان اور عادل بادشاہ تھا۔ یسعیاہ نبی کی پیشین گوئی میں اُس کا نام خورس بیان کیا گیا ہے۔ یہ سائرس ہی کی ذرا سی بدلی ہوئی شکل ہے جو خسرو کے نام کا یونانی تلفظ ہے۔ ارشاد ہوا ہے:

> ’’خداوند اپنے ممسوح خورس کے حق میں یوں فرماتا ہے کہ میں نے اُس کا دہنا ہاتھ پکڑا کہ امتوں کو اُس کے سامنے زیر کروں اور بادشاہوں کی کمریں کھلواڈالوں۔‘‘ (یسعیاہ ۴۵:۱)

بائیبل میں دانیال نبی کا ایک مکاشفہ نقل کیا گیا ہے، اُس میں وہ کہتے ہیں:

لَهٗ فِی الۡاَرۡضِ وَاٰتَیۡنٰهُ مِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ سَبَبًا﴿۸۴﴾ فَاَتۡبَعَ سَبَبًا﴿۸۵﴾ حَتّٰۤی اِذَا بَلَغَ مَغۡرِبَ

سناتا ہوں[۸۷]۔ ہم نے اُس کو زمین میں اقتدار عطا فرمایا تھا اور اُس کو ہر قسم کے اسباب و وسائل بخشے تھے۔ پھر اُس نے (ایک مرتبہ) ایک مہم کا سامان کیا، یہاں تک کہ جب وہ سورج کے غروب ہونے کی جگہ

''تب میں نے آنکھ اٹھا کر نظر کی اور کیا دیکھتا ہوں کہ دریا کے پاس ایک مینڈھا کھڑا ہے جس کے دو سینگ ہیں۔ دونوں سینگ اونچے تھے، لیکن ایک دوسرے سے بڑا تھا اور بڑا دوسرے کے بعد نکلا تھا۔ میں نے اُس مینڈھے کو دیکھا کہ مغرب و شمال و جنوب کی طرف سینگ مارتا ہے، یہاں تک کہ نہ کوئی جانور اُس کے سامنے کھڑا ہو سکا اور نہ کوئی اُس سے چھڑا سکا۔'' (دانی ایل ۸: ۳-۴)

اِس مکاشفے کی تعبیر جبریل علیہ السلام نے حضرت دانیال کو یہ بتائی کہ دو سینگوں سے مراد مادا اور فارس کی دو سلطنتیں ہیں جنھیں موعود بادشاہ زیرنگیں کرے گا۔ عرب کے یہود غالباً اِسی بنا پر خورس کو ذوالقرنین کہتے تھے، اِس لیے کہ یہ دونوں سلطنتیں اُس نے زیرنگیں کر لی تھیں۔ یہودیوں میں اِس ''دو سینگوں والے'' کا بڑا چرچا تھا، کیونکہ اِسی کی ٹکر نے بالآخر بابل کی سلطنت کو بھی پاش پاش کیا اور بنی اسرائیل کو اسیری سے نجات دلائی جس کے نتیجے میں یہود کے لیے ممکن ہوا کہ وہ بیت المقدس اور ہیکل کو از سر نو تعمیر کریں۔ اُس کا ایک مجسمہ ماضی قریب میں اصطخر کے نزدیک دریافت ہوا ہے جو اردشیر اول کے زمانے کا نصب کردہ ہے۔ اُس میں اُس کے تاج میں دو سینگ بھی ابھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بھی اُسی چیز کی علامت ہوں جس کی بنا پر یہود اُسے ذوالقرنین کہتے تھے۔

اُس کی جن مہمات کا ذکر آگے ہوا ہے، اُن میں سے دو مہمیں — مشرقی اور مغربی — تو تاریخ کی روشنی میں ثابت ہیں، اِس لیے کہ اُس کی فتوحات یقیناً مغرب میں ایشیاے کوچک اور شام کے سواحل تک اور مشرق میں باختر (بلخ) تک وسیع ہو گئی تھیں۔ مگر شمال یا جنوب میں اُس کی کسی بڑی مہم کا سراغ تاریخ میں نہیں ملتا، جب کہ قرآن اُس کا ذکر بڑی صراحت کے ساتھ کرتا ہے۔ تاہم شواہد و قرائن اِس کے بھی موجود ہیں، کیونکہ تاریخ کی رو سے خورس کی سلطنت شمال میں قفقاز تک وسیع ہو گئی تھی۔

۸۷؎ آیت کی ابتدا 'سَاَتۡلُوۡا' سے ہوئی ہے اور تذکرے کے لیے اُس میں لفظ 'ذِکۡر' آیا ہے۔ اِس میں، اگر غور کیجیے تو ایک قسم کی اپیل مضمر ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...مطلب یہ ہے کہ پوچھتے ہو تو میں اُن کی سرگذشت کا کچھ سبق آموز حصہ سناؤں گا۔ امید ہے گوش دل سے سنو گے اور اُس سے فائدہ اٹھاؤ گے۔ لفظ 'ذِکۡر' میں یاددہانی، تذکیر اور سبق آموزی کا جو مفہوم مضمر ہے،

الشَّمۡسِ وَجَدَهَا تَغۡرُبُ فِیۡ عَیۡنٍ حَمِئَةٍ وَّوَجَدَ عِنۡدَهَا قَوۡمًا قُلۡنَا یٰذَا الۡقَرۡنَیۡنِ اِمَّآ
اَنۡ تُعَذِّبَ وَاِمَّآ اَنۡ تَتَّخِذَ فِیۡهِمۡ حُسۡنًا ﴿۸۶﴾ قَالَ اَمَّا مَنۡ ظَلَمَ فَسَوۡفَ نُعَذِّبُهٗ

تک پہنچا تو اُس نے سورج کو دیکھا کہ ایک سیاہ کیچڑ کے چشمے میں ڈوب رہا ہے[۸۸] اور اُس کے پاس اُسے ایک قوم ملی۔ ہم نے کہا: اے ذوالقرنین، (یہ تیرے اختیار میں ہیں کہ) چاہو تو اِنھیں سزا دو اور چاہو تو اِن کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔[۸۹] اُس نے کہا: جو اِن میں سے ظلم کرے گا، ہم اُس کو سزا ہی دیں گے، پھر

وہ اہل نظر سے مخفی نہیں ہے۔'' (تدبرقرآن ۴/ ۶۱۶)

۸۸؎ اِس سے واضح ہے کہ پچھلے جملے میں سورج کے ڈوبنے کی جگہ تک پہنچنا درحقیقت مغرب کی جانب خشکی کے آخری سرے تک پہنچنے کی تعبیر ہے جس کے آگے سمندر تھا اور جہاں غروب آفتاب کے وقت ایسا نظر آتا تھا کہ گویا وہ کسی سیاہ کیچڑ کے چشمے میں ڈوب رہا ہے۔ اِسے چشمہ غالباً اِس لیے کہا ہے کہ ایشیاے کوچک کے مغربی ساحل پر بحرایجین چھوٹی چھوٹی خلیجوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ مغرب کی طرف اُس وقت کی تمام معلوم دنیا ذوالقرنین نے اِس مہم میں زیرنگیں کر لی تھی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''یہ کیخسرو کی پہلی مہم کی طرف اشارہ ہے جو اُس کے دارالسلطنت ہک متانہ (موجودہ ہمدان) سے مغرب کے لیے ہوئی۔ اِس مہم میں اُس نے مادا (موجودہ عراق و شام) اور لیڈیا (موجودہ ترکی) کو زیرنگین کیا۔ لیڈیا کے دارالحکومت سارڈیس (نزد سمرنا) میں وہاں کے حکمران کروسس کو اُس نے شکست دی جس کو بابل، مصر اور اسپارٹا کی حکومتوں کی حمایت بھی حاصل تھی۔ اِس مہم میں کیخسرو کے قدم بحیرۂ روم کے ساحل ہی پر جا کے رکے۔''
(تدبرقرآن ۴/ ۶۱۷)

۸۹؎ یہ صورت حال کی زبان سے ذوالقرنین کے اختیار و اقتدار کا بیان ہے۔ اِس کے لیے اُس کا مخاطبۂ الٰہی سے مشرف ہونا ضروری نہیں ہے۔ عربی زبان میں لفظ 'قَوۡل' اِس طرح کی تعبیرات کے لیے بھی آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اِس فتح کے نتیجے میں ہم نے ایسا اختیار اِن لوگوں پر تمھیں دے دیا ہے کہ اب تم اِن کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے ہو۔ تمھارے اختیار و اقتدار میں کوئی مداخلت کرنے والا نہیں ہے۔ یہ اُسی طرح کی تعبیر ہے جو سورۂ صٓ (۳۸) کی آیت ۳۹ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے 'فَامۡنُنۡ اَوۡ اَمۡسِكۡ بِغَيۡرِ حِسَابٍ' کے الفاظ میں آئی ہے۔ اِس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے اجازت دے دی تھی کہ وہ چاہے ظلم کرے، چاہے انصاف سے کام لے۔

ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ﴿۸۷﴾ وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ
جَزَآءَنِ الْحُسْنٰى وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا﴿۸۸﴾
ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا﴿۸۹﴾ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ
لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا﴿۹۰﴾ كَذٰلِكَ وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا﴿۹۱﴾

وہ اپنے پروردگار کی طرف لوٹایا جائے گا تو وہ بھی اُس کو سخت سزا دے گا۔ اِس کے برخلاف جو ایمان لائے گا اور اچھا عمل کرے گا، اُس کے لیے (اُس کے پروردگار کے پاس بھی) اچھی جزا ہے اور ہم بھی اُس کے ساتھ اپنا معاملہ آسان کریں گے۔[۹۰] ۸۳-۸۸

پھر اُس نے ایک دوسری مہم کا سامان کیا، یہاں تک کہ جب وہ طلوع آفتاب کی جگہ تک پہنچا[۹۱] تو اُس کو دیکھا کہ وہ ایک ایسی قوم پر طلوع ہو رہا ہے جن کے لیے ہم نے آفتاب کے اِدھر کوئی آڑ نہیں رکھی تھی۔[۹۲] یہ اِسی طرح ہوا[۹۳] اور جو کچھ ذوالقرنین کے پاس تھا، اُسے ہم خوب جانتے تھے۔[۹۴] ۸۹-۹۱

۹۰؎ اوپر کی بات جس طرح زبان حال سے ہے، اُسی طرح یہ زبان عمل سے ہے، یعنی اُس نے اپنے رویے اور طرز عمل سے اِس بات کی شہادت دی۔ آیت میں دیکھیے تو 'سَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا' کے ٹکڑے میں بھی لفظ 'قَوْل' اِسی مفہوم میں ہے۔ ذوالقرنین کا ایمان و عقیدہ کیا تھا؟ یہ آیات اُس کا پتا دیتی ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''اِن آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین ایک مومن، موحد اور آخرت پر یقین رکھنے والا بادشاہ تھا۔ تاریخوں سے بھی اِس بات کی تائید و تصدیق ہوتی ہے۔ سائرس زردشت کا ہم عصر اور اُس کا پیرو تھا۔ زردشت کی اصل تعلیمات میں ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کا صحیح تصور ملتا ہے۔ اگرچہ بعد میں دوسرے مذاہب کی طرح یہ مذہب بھی تحریفات کی دست برد سے محفوظ نہیں رہا، بلکہ ثنویت کے تصورات اُس پر غالب آ گئے۔ دارا اپنے کتبوں میں اہورمزدا (اللہ) کا شکر ادا کرتا ہے۔ اپنی سلطنت کو اُس کے فضل و کرم سے منسوب کرتا ہے اور اُس سے راہ راست پر قائم رہنے کی توفیق مانگتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دین داری اُس کو ذوالقرنین ہی سے وراثت میں ملی۔ ذوالقرنین کو انبیاے بنی اسرائیل سے بھی بڑی عقیدت تھی۔ یہ چیز بھی اُس کے اندر دینی رجحانات کی تقویت کا باعث ہوئی۔'' (تدبر قرآن ۴/ ۶۱۹)

۹۱؎ یعنی جس طرح مغرب میں خشکی کے آخری سرے تک پہنچ گیا تھا، اُسی طرح مشرق میں بھی پہنچ گیا۔

www.javedahmedghamidi.org
www.al-mawrid.org

ثُمَّ اَتۡبَعَ سَبَبًا ﴿۹۲﴾ حَتّٰۤی اِذَا بَلَغَ بَیۡنَ السَّدَّیۡنِ وَجَدَ مِنۡ دُوۡنِہِمَا قَوۡمًا لَّا یَکَادُوۡنَ یَفۡقَہُوۡنَ قَوۡلًا ﴿۹۳﴾ قَالُوۡا یٰذَا الۡقَرۡنَیۡنِ اِنَّ یَاۡجُوۡجَ وَ مَاۡجُوۡجَ مُفۡسِدُوۡنَ

اُس نے پھر ایک اور مہم کا سامان کیا۹۵، یہاں تک کہ جب دو پہاڑوں کے درمیان (ایک درے تک) پہنچا۹۶ تو اُن کے اِس طرف اُس کو ایسے لوگ ملے جو کوئی بات سمجھ نہیں پاتے تھے۹۷۔ اُنھوں نے درخواست

۹۲؎ مطلب یہ ہے کہ وہ بالکل وحشی اور غیر متمدن تھے۔ عمارتیں بنانا تو درکنار، اپنے لیے خیمے بھی نہیں بنا سکتے تھے۔ چنانچہ خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے اور کھلے میدانوں میں رہتے تھے، جہاں اُن کے اور سورج کے مابین کوئی آڑ نہیں تھی۔ مورخین کا بیان ہے کہ اِس سے مکران، قندھار اور بلخ کے وحشی اور صحرا گرد قبائل مراد ہیں جنھوں نے فارس کی مشرقی سرحد پر اُس زمانے میں بدامنی پھیلا رکھی تھی۔ ذوالقرنین کو بالآخر اُن کی سرکوبی کے لیے اٹھنا پڑا جس کے نتیجے میں یہ علاقے بھی اُس نے فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۹۳؎ یعنی فی الواقع یہی ہوا کہ وہ علاقے فتح کرتا ہوا اُس وقت کی متمدن دنیا کے آخری کنارے تک پہنچ گیا اور اپنی سلطنت مغرب سے مشرق تک وسیع کر لی۔

۹۴؎ یہ اُسی طرح کا جملہ ہے، جیسے سورۂ انبیاء (۲۱) کی آیت ۵۱ میں ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا ہے کہ 'وَلَقَدۡ اٰتَیۡنَاۤ اِبۡرٰہِیۡمَ رُشۡدَہٗ مِنۡ قَبۡلُ وَکُنَّا بِہٖ عٰلِمِیۡنَ'۔ مطلب یہ ہے کہ ذوالقرنین کو یہ سرفرازی یوں ہی حاصل نہیں ہوگئی، بلکہ وہ اِس کی اہلیت رکھتا تھا۔ یہ ایک عظیم سلطنت تھی اور وہ بدرجۂ کمال اُن صلاحیتوں سے بہرہ مند تھا جو اِس کو سنبھالنے اور اِس کا نظم و نسق چلانے کے لیے ضروری تھیں۔ اِس کے ساتھ وہ اُن اخلاقی اوصاف سے بھی پوری طرح متصف تھا جو خدا ترس بادشاہوں میں ہونے چاہییں اور ہم اُس کی اِن تمام صلاحیتوں اور تمام اوصاف حمیدہ سے واقف تھے۔

۹۵؎ یہ تیسری مہم کا ذکر ہے۔ اِس میں ذوالقرنین کو کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ غالباً اِسی بنا پر مورخین اِس کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔ تاہم اتنا بتاتے ہیں کہ بابل کی فتح کے بعد وہ شمال مشرق کی سمت ایک سفر پر روانہ ہوا تھا۔ اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُس کی منزل غالباً بحر خزر (کیسپین) کے مشرق میں ترکستان کی جانب رہی ہوگی۔

۹۶؎ آگے ذکر ہوا ہے کہ اِن دونوں پہاڑوں کے اُس طرف یاجوج و ماجوج کا علاقہ تھا۔ اِس لیے لامحالہ اِن سے مراد وہ پہاڑی سلسلے ہی ہو سکتے ہیں جو بحر خزر اور بحر اسود کے درمیان واقع ہیں۔

فِی الۡاَرۡضِ فَهَلۡ نَجۡعَلُ لَكَ خَرۡجًا عَلٰۤی اَنۡ تَجۡعَلَ بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَهُمۡ سَدًّا ﴿۹۴﴾
قَالَ مَا مَكَّنِّیۡ فِیۡهِ رَبِّیۡ خَیۡرٌ فَاَعِیۡنُوۡنِیۡ بِقُوَّةٍ اَجۡعَلۡ بَیۡنَكُمۡ وَ بَیۡنَهُمۡ رَدۡمًا ﴿۹۵﴾

کی کہ اے ذوالقرنین، یاجوج اور ماجوج[98] اِس سرزمین میں فساد پھیلاتے ہیں[99]۔ تو کیا یہ ہوسکتا ہے کہ ہم آپ کے لیے اخراجات کا بندوبست کریں اور آپ ہمارے اور اُن کے درمیان کوئی روک بنا دیں۔ اُس نے جواب دیا کہ جو کچھ میرے پروردگار نے میرے اختیار میں دے رکھا ہے، وہ بہتر ہے[100]۔ تم البتہ ہاتھ پاؤں سے میری مدد کرو، میں تمھارے اور اُن کے درمیان ایک دیوار کھڑی کیے دیتا ہوں[101]۔

۹۷؎ یعنی اُن کی زبان ذوالقرنین اور اُس کے ساتھیوں کے لیے قریب قریب بالکل اجنبی تھی۔ اِس کی وجہ غالباً یہ رہی ہوگی کہ وہ اپنے علاقے کے اندر محدود اور دوسروں سے بالکل بے تعلق زندگی بسر کرتے تھے۔ اپنے علاقے کے باہر کے لوگوں کے ساتھ اُن کا کوئی میل جول نہیں تھا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۹۸؎ یہ دونوں نوح علیہ السلام کے بیٹے یافث کی اولاد میں سے ہیں اور جو ایشیا کے شمالی علاقوں میں آباد ہوئی۔ صحیفۂ حزقی ایل میں اِن کا تعارف روس، ماسکو اور توبالسک کے فرماں روا کی حیثیت سے کرایا گیا ہے۔ حزقی ایل فرماتے ہیں:

’’اور خداوند کا کلام مجھ پر نازل ہوا کہ اے آدم زاد، جوج کی طرف جو ماجوج کی سرزمین کا ہے اور روش اور مسک اور توبل کا فرماں روا ہے متوجہ ہو اور اُس کے خلاف نبوت کر۔‘‘ (حزقی ایل ۳۸: ۱-۲)

’’پس اے آدم زاد، تو جوج کے خلاف نبوت کر اور کہہ، خداوند خدا یوں فرماتا ہے: دیکھ اے جوج، روش، مسک اور توبل کے فرماں روا، میں تیرا مخالف ہوں اور میں تجھے پھرا دوں گا اور تجھے لیے پھروں گا اور شمال کے دور اطراف سے چڑھا لاؤں گا۔ (حزقی ایل ۳۹: ۱-۲)

۹۹؎ یہ اُس زمانے کے وحشی قبائل تھے اور قدیم زمانے سے متمدن علاقے پر غارت گرانہ حملے کرتے رہتے تھے۔ ایران پر اِن کی تاخت ترکستان کے راستے سے بھی ہوتی تھی اور قفقاز پہاڑوں کے اُس درے سے بھی جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔

۱۰۰؎ اصل میں لفظ ’خَیۡر‘ استعمال ہوا ہے۔ اِس میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہے: ایک یہ کہ یہ کافی ہے اور دوسرے یہ کہ یہ نہایت پاکیزہ مال ہے، اِس میں لوٹ مار اور تعدی کی کوئی آلایش نہیں ہے۔

اٰتُوۡنِیۡ زُبَرَ الۡحَدِیۡدِ حَتّٰۤی اِذَا سَاوٰی بَیۡنَ الصَّدَفَیۡنِ قَالَ انۡفُخُوۡا حَتّٰۤی اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا قَالَ اٰتُوۡنِیۡۤ اُفۡرِغۡ عَلَیۡهِ قِطۡرًا ﴿۹۶﴾ فَمَا اسۡطَاعُوۡۤا اَنۡ یَّظۡهَرُوۡهُ وَمَا اسۡتَطَاعُوۡا لَهٗ نَقۡبًا ﴿۹۷﴾ قَالَ هٰذَا رَحۡمَةٌ مِّنۡ رَّبِّیۡ فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ رَبِّیۡ جَعَلَهٗ دَکَّآءَ وَکَانَ وَعۡدُ رَبِّیۡ حَقًّا ﴿۹۸﴾

مجھے لوہے کی سلیں لا دو۔ (چنانچہ وہ فراہم کر دی گئیں)، یہاں تک کہ جب اُس نے دونوں پہاڑوں کے درمیان خلا[۱۰۲] کو پاٹ دیا تو کہا کہ دھونکو، حتیٰ کہ جب اُس کو آگ کر دیا تو حکم دیا کہ لاؤ، اب میں اِس پر پگھلا ہوا تانبا انڈیل دوں۔ سو (یہ ایسی دیوار بن گئی کہ) یاجوج و ماجوج اب نہ اُس پر چڑھ سکتے تھے، نہ اُس میں نقب لگا سکتے تھے۔ ذوالقرنین نے کہا: یہ میرے پروردگار کی رحمت ہے۔ پھر جب میرے پروردگار کے وعدے کا ظہور ہو گا تو وہ اِس کو ڈھا کر برابر کر دے گا اور میرے پروردگار کا وعدہ برحق ہے[۱۰۳]۔ ۹۲-۹۸

www.javedahmadghamidi.org www.al-mawrid.org

۱۰۱؎ اِس طرح کی ایک قدیم دیوار کے آثار کوہ قفقاز کے درۂ داریال میں موجود ہیں۔ سیاح اپنے سفرناموں میں اِس کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ دیوار ۵۰ میل لمبی، ۲۹۰ فٹ اونچی اور ۱۰ فٹ چوڑی تھی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...روایات میں ہے کہ عباسی خلیفہ واثق نے اِس دیوار کی تحقیقات پر پچاس افراد کی ایک ٹیم مقرر کی جس نے اِس کے موقع و محل کا سراغ لگایا۔ اِس دیوار کو لوگ دارا یا نوشیرواں کی طرف منسوب کرتے ہیں، لیکن زیادہ شواہد اِس بات کے حق میں ہیں کہ یہ کیخسرو نے تعمیر کرائی ہو گی۔ مثلاً یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ کیخسرو کی سلطنت کی شمالی حد کوہ قفقاز تک تھی۔ اتنا وسیع علاقہ زیرنگین کر لینا صرف اُس صورت میں ممکن ہے، جب اُس نے اِس علاقہ کو فتح کرنے کے لیے کوئی اقدام کیا ہو۔ کورش نام کا ایک شہر اور ایک دریا کوہ قفقاز کے علاقے میں اب تک موجود ہے۔ آہنی دیوار کو گورا کا نام دیا جاتا ہے جو کورش ہی کی بگڑی ہوئی شکل معلوم ہوتی ہے۔ یہ دیوار دھات سے دو پہاڑیوں کے درمیان بنی ہوئی ہے اور اِس کے نچلے حصے میں برسات کے پانی کے نکلنے کے لیے کچھ جگہ چھوڑ دی گئی ہے۔'' (تدبرقرآن ۴/ ۶۲۱)

۱۰۲؎ اصل میں 'سَاوٰی بَیۡنَ الصَّدَفَیۡنِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ 'صَدَف' خول اور خلا کو کہتے ہیں۔ یہاں اِس کے مثنیٰ استعمال کرنے میں اِس کے دونوں طرفوں کا لحاظ ہے۔

۱۰۳؎ یہ قرآن نے نہایت خوبی کے ساتھ قصۂ ذوالقرنین کو سورہ کے مضمون سے متعلق کر دیا ہے۔ مطلب یہ

ہے کہ اُس نے تنگ ظرفوں کی طرح یہ نہیں کہا کہ یہ میں وہ کارنامہ کیے جا رہا ہوں جس پر کبھی زوال نہ آئے گا، بلکہ نہایت عاجزی کے ساتھ اُسے اپنے پروردگار کی رحمت وعنایت اور اُس کے فضل وکرم کا کرشمہ قرار دیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''پیچھے دو شخصوں کی تمثیل کے ذیل میں مغرورین دنیا کی یہ ذہنیت آپ پڑھ چکے ہیں کہ جب وہ اپنی کامیابی کے ہرے بھرے باغ میں داخل ہوتے ہیں تو غرور کے نشے میں کہتے ہیں کہ 'مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا'، ''میں گمان بھی نہیں کرتا کہ یہ باغ کبھی تباہ ہو سکے گا۔'' اِس کے بعد ایک عبد شاکر کی ذہنیت نمایاں فرمائی ہے کہ وہ اپنے بڑے سے بڑے کارنامہ پر بھی اپنے رب کا شکر گزار ہوتا ہے اور اللہ کے شدنی وعدۂ آخرت کو یاد رکھتا ہے۔''

(تدبر قرآن ۴/ ۶۲۲)

[باقی]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

محمد وسیم اختر مفتی

حضرت فاطمہ بنت خطاب رضی اللہ عنہا

حضرت فاطمہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سگی بہن تھیں۔ ان کے والد کا نام خطاب اور دادا کا نام نفیل بن عبدالعزیٰ تھا۔ اپنے قبیلے میں ایک ممتاز مقام رکھنے کے باوجود خطاب مال و دولت والے نہ تھے، ایک زمانے میں وہ لکڑیاں ڈھوتے تھے۔ عدی بن کعب حضرت فاطمہ بنت خطاب کے آٹھویں اور کعب بن لؤی نویں جد تھے۔ عدی کے بھائی مرہ بن کعب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آٹھویں جد تھے۔ اس طرح کعب بن لؤی پر ان کا شجرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شجرے سے جا ملتا ہے۔ زمانۂ جاہلیت کے موحد زید بن عمرو بن نفیل بھی بنو عدی سے تعلق رکھتے تھے۔ حضرت فاطمہ کے والد خطاب بن نفیل، زید بن عمرو بن نفیل کے چچا ہونے کے ساتھ ماں جائے بھائی بھی تھے، اس لیے کہ ان دونوں کی ماں جیداء پہلے نفیل اور پھر ان کے بیٹے عمرو کے نکاح میں رہی۔ جاہلیت میں ایسی شادیاں عام تھیں، قرآن مجید نے اسے بے حیائی اور گناہ والا نکاح قرار دے کر حرام کر دیا:

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ، اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا وَسَآءَ سَبِيْلًا. (النساء ۴: ۲۲)

''ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمھارے آبا نکاح کر چکے، مگر جو پہلے ہو چکا، سو ہو چکا۔ یقیناً یہ کھلی بے حیائی، قابل نفرت کام اور برا چلن ہے۔''

جب زید نے بتوں کی پوجا اور ان کے چڑھاوے چھوڑے اور لوگوں کو بھی ان کی عبادت سے منع کرنے لگے تو خطاب نے ان کی شدید مخالفت کی اور قبیلے کے لوگوں کے ساتھ مل کر انھیں مکہ سے نکال باہر کیا۔ خطاب نے عربوں کی مشہور جنگ حرب فجار میں بھی شرکت کی۔

خطاب نے کثرت اولاد کی خاطر کئی شادیاں کیں، ان کی ایک زوجہ حنتمہ بنت ہاشم بنومخزوم سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان سے حضرت فاطمہ اور حضرت عمر کی ولادت ہوئی۔ حضرت فاطمہ، حضرت عمر اور حضرت زید بن خطاب سے چھوٹی تھیں۔

حضرت فاطمہ بنت خطاب کی شادی اپنے چچا کے پوتے حضرت سعید بن زید سے ہوئی۔ میاں بیوی، دونوں کا شمار قرآن مجید کے بیان کردہ 'اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ'* میں ہوتا ہے۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دار ارقم میں داخل ہونے سے پہلے اسلام قبول کیا، تاہم اپنا اسلام چھپائے رکھا۔ حضرت سعید کے والد زید بن عمرو بن نفیل نے دعا کی تھی کہ اے اللہ، اگر تو نے مجھے نعمت اسلام پانے کی مہلت نہ دی تو میرے بیٹے سعید کو اس سے محروم نہ رکھنا۔ ان کی تربیت اور دعا ہی کا نتیجہ تھا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان نبوت کیا تو وہ فوراً (۶۱۱ء، ۲/ نبوی) مسلمان ہو گئے۔ بعض روایات کے مطابق حضرت فاطمہ بنت خطاب ان سے بھی پہلے ایمان لا چکی تھیں۔ ابن اسحٰق کی ترتیب کردہ پہلے پچاس مسلمانوں کی فہرست میں حضرت سعید بن زید کا سترھواں اور حضرت فاطمہ بنت خطاب کا اٹھارواں نمبر ہے۔

ابن سعد نے ''النسب'' نامی کتاب کے حوالے سے حضرت سعید کی اہلیہ کا نام حضرت فاطمہ بنت خطاب کے بجائے حضرت رملہ بنت خطاب نقل کیا اور کہا کہ یہی ام جمیل ہیں۔ کسی دوسرے حوالے سے ان کی بات کی تائید نہیں ہوتی۔ دارقطنی نے ان کا نام حضرت امیمہ بتایا۔ ابن حجر نے ان مختلف روایات میں اس طرح توافق کیا کہ نام: فاطمہ، لقب: امیمہ اور کنیت: ام جمیل ہے۔ Wikipedia کے مضمون نگار نے حضرت فاطمہ، حضرت رملہ، حضرت ام جمیل کو ایک ہی شخصیت قرار دیا ہے۔

حضرت فاطمہ بنت خطاب اور ان کے شوہر حضرت سعید بن زید مکہ ہی میں مقیم رہے اور حبشہ ہجرت نہ کی۔

حضرت عمر بن خطاب میں شدید قومی عصبیت پائی جاتی تھی۔ وہ دین جاہلی پر اسلام کی آمد سے پڑنے والی مصیبت کو رفع کرنا چاہتے تھے۔ ۵/ نبوی میں ہونے والی ہجرت حبشہ نے ان میں قریش کے تتر بتر ہونے کا شدید احساس پیدا کر دیا تھا۔ انھیں اس کا حل یہی سوجھا کہ اسلامی دعوت کے منبع حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دیں تاکہ قوم پھر متحد ہو جائے۔ ابوجہل نے انھیں سو اونٹ اور ایک ہزار اوقیہ چاندی انعام دینے کا وعدہ کیا۔ ۶/ نبوی میں وہ اپنی تلوار لہراتے ہوئے دار ارقم کو روانہ ہوئے جہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور چالیس کے قریب مسلمان مجتمع تھے۔

---

* التوبہ ۹: ۱۰۰۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

راستے میں حضرت نعیم بن عبداللہ ملے، انھوں نے سمجھایا کہ کیوں دیوانہ ہو رہے ہو، اگر تم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کیا تو بنو عبد مناف تمھیں جیتا نہ چھوڑیں گے۔ اپنے گھر کے معاملات کیوں نہیں سدھار لیتے، تمھاری بہن فاطمہ بنت خطاب اور بہنوئی سعید بن زید مسلمان ہو چکے ہیں۔ حضرت عمر فوراً واپس پلٹے، بہن کے گھر میں حضرت خباب بن ارت سورۂ طٰہٰ کی تعلیم دے رہے تھے، ان کی آہٹ سن کر چھپ گئے۔ حضرت عمر اپنے بہنوئی سے گتھم گتھا ہوئے، بہن نے چھڑانا چاہا تو ان کا سر پھاڑ دیا۔ آخر کار دونوں نے اقرار کر لیا کہ وہ اللہ و رسول پر ایمان لے آئے ہیں، جو آپ کے جی میں آتا ہے کر لیں۔ اب حضرت عمر شرمندہ ہو گئے اور قرآن کا وہ صفحہ مانگا جو وہ پڑھ رہے تھے۔ بہن اور بہنوئی کے اصرار پر انھوں نے غسل کیا، ورق ہاتھ میں لے کر آیات قرآنی تلاوت کرنے کی دیر تھی کہ ان کی کیفیت بدل گئی، وہ رونے لگے۔ حضرت خباب نے موقع کا فائدہ اٹھایا، حضرت عمر کے سامنے آ گئے اور انھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ دعا سنا کر دعوت اسلام دے ڈالی جو آپ نے حال ہی میں فرمائی تھی: ''اے اللہ، اسلام کو ابوالحکم بن ہشام (ابوجہل) یا عمر بن خطاب کی تائید عطا کر۔'' انھوں نے مزید کہا کہ اللہ نے ابوجہل کے بجائے آپ کو دعوت نبوی کی تائید کے لیے چن لیا ہے۔ حضرت عمر نے علی الفور خدمت نبوی میں پیش ہونے کی خواہش کی، حضرت خباب انھیں کوہ صفا کے قریب دار ارقم میں لے آئے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور کچھ صحابہ جمع تھے، ان سب کے سامنے حضرت عمر ایمان لے آئے۔ آپ نے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کر کے ان کے قبول اسلام کا خیر مقدم کیا۔

حضرت فاطمہ بنت خطاب کے علاوہ حضرت سعید بن زید کی زوجیت میں سات مزید بیویاں اور بارہ امہات اولاد آئیں۔ ان کی کل اولاد کا شمار چودہ لڑکے اور انیس لڑکیاں کیا گیا ہے۔ حضرت رملہ بنت خطاب (یا حضرت فاطمہ بنت خطاب) سے عبدالرحمٰن (اکبر) نامی ایک ہی بیٹا پیدا ہوا۔

ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ حضرت فاطمہ بنت خطاب نے اپنے شوہر حضرت سعید بن زید کے ساتھ مدینہ ہجرت کی۔ مدینہ میں ان کی زندگی کیسے گزری اور ان کی وفات کب ہوئی؟ افسوس ہے کہ ہمیں اس کی کہیں سے اطلاع نہ ہو سکی۔ حضرت سعید بن زید کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شام بھیج رکھا تھا، اس لیے وہ جنگ بدر میں حصہ نہ لے سکے، البتہ انھوں نے غزوۂ احد اور باقی غزوات میں حصہ لیا اور ۵۱ھ (۶۷۱ء) میں عہد اموی میں فوت ہوئے۔ ان کی مدنی زندگی کے تمام حالات کتب سیر صحابہ میں پائے جاتے ہیں، جب کہ حضرت فاطمہ بنت خطاب کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔

ابن حجر نے واقدی کے حوالہ سے حضرت فاطمہ بنت خطاب سے مروی ایک روایت نقل کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت برابر خیر میں رہے گی، جب تک (اس کے) فاسق علما، جاہل قرا اور جابر حکمرانوں میں

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

دنیا کی محبت ظاہر نہ ہوگی۔ جب ایسا ہوا تو مجھے اندیشہ ہے کہ اللہ ان پر عمومی عذاب نازل کر دے گا۔اس سماعی روایت کے مضمون سے محسوس ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کا آخری دور بھی دیکھا ہوگا۔

مطالعۂ مزید: السیرۃ النبویۃ (ابن ہشام)، الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبدالبر)، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر)، البدایۃ والنہایۃ (ابن کثیر)، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (ابن حجر)، Wikipedia۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

مقالات

ڈاکٹر عرفان شہزاد

قانونِ اتمامِ حجت اور اس کے اطلاقات

نمایاں اعتراضات کا جائزہ

(۶)

(گذشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

دین میں جبر کی نفی اور اتمام حجت کے بعد کی سزا

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ دین تسلیم کرانے میں جبر روا نہیں تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتمام حجت کے بعد آپ کے منکرین پر قتل و محکومی کی سزا کا نفاذ کیا جبر نہیں ہے؟

معاملہ دراصل یوں ہے کہ دنیا میں لوگ خدا کی طرف سے اس حق کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں کہ وہ اپنے خالق کو پہچانیں، اس پر ایمان لائیں اور اس کی عبادت کریں، ان کی پیدایش کا مقصد ہی یہ بتایا گیا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ. (الذاریات ۵۱: ۵۶)

''میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اِس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔''

انسان جب خدا شناسی اور خداے واحد کی عبادت کے اپنے اس مقصد پیدایش سے غافل ہو جاتا ہے تو خدا کی رحمت اسے اس طرف متوجہ کرنے کے لیے اس کی عقل و فطرت کی گواہی اور وحی کے ذریعے سے بھی یاد دہانی کراتی ہے۔ اب اگر کوئی آخری درجے میں اتمام حجت کے بعد بھی انکار پر قائم رہتا ہے، باوجود اس کے کہ اس کے پاس

انکار کا کوئی عذر بھی نہ رہتا تو وہ اپنا مقصد پیدایش کھو دیتا ہے، چنانچہ اپنا زندہ رہنے کا حق بھی کھو دیتا ہے۔ ایسے افراد کے لیے خدا کی طرف سے ان کی موت کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ یہ جبر نہیں، بلکہ ان کے حق زندگی کے خاتمے کا اعلان ہے۔ یہ معلوم ہے کہ یہ اتمام حجت اس دنیا میں رسولوں کے ذریعے سے ہی ممکن تھا۔ رسول کے براہ راست مخاطبین کے علاوہ جو لوگ ہیں، ان پر ان کی عقل وفطرت اور وحی کے ذریعے سے بھی حجت کسی نہ کسی درجے میں قائم ہوتی رہتی ہے، لیکن ان پر آخری درجے میں حجت کا تمام ہونا بہت مشکل ہے اور اگر ہو بھی جائے تو اس کے معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہیں، کیونکہ یہ انسانی ضمیر کا معاملہ ہے اور اس کی اطلاع ایک رسول کو بھی نہیں ہوتی، خدا ہی اسے مطلع کرتا ہے۔ چنانچہ اجتماعی سطح پر ایسے افراد واقوام جن پر رسول نے اتمام حجت نہیں کیا، ان کا انکار بھی بلا عذر ہے، اس کا فیصلہ کرنا اب ممکن نہیں۔ اس لیے اجتماعی سطح پر ان پر سزا کا نفاذ بھی اس دنیا میں نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا فیصلہ آخرت میں کیا جائے گا۔ لیکن جن پر اتمام حجت رسولوں کے ذریعے سے ہوا اور انھوں نے بلا عذر انکار پر اصرار کیا، ان کی موت کا فیصلہ خدا کی طرف سے اس دنیا میں ہی کر دیا گیا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

موت کا یہ فیصلہ دو صورتوں میں آیا: قدرتی آفات کے ذریعے سے اور رسول کے ساتھیوں کی تلواروں کے ذریعے سے۔ جب یہ فیصلہ قدرتی طاقتوں کے ذریعے سے ناگہانی آفات کی صورت میں لاگو کیا گیا تو جبر کا سوال پیدا نہیں ہوا، کیونکہ خدائی فعل صاف دکھائی دے رہا تھا، لیکن جب یہی فیصلہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت تلوار کے ذریعے سے نافذ ہوا تو محل اشکال بن گیا کہ کچھ انسان دوسرے انسانوں کو اپنی مرضی سے اپنے عقیدے پر جینے کی اجازت کیوں نہیں دے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی واضح نصوص کے مطابق خدا نے صحابہ کے ہاتھوں سے یہ عذاب ان پر نازل کیا تھا۔ اس واقعے کی ظاہری صورت سے ہٹ کر معاملے کی درست نوعیت اگر ذہن میں رہے تو جبر سے متعلق مذکورہ سوال کا جواب مل جاتا ہے۔ اصول یہ ہے کہ منکرین حق کو اتمام حجت کے بعد مرنا پڑا، کیونکہ وہ اپنی پیدایش کا مقصد ہی فوت کر بیٹھے تھے۔ خدا کی طرف سے آنے والے عذاب کی ان دونوں صورتوں میں ایک ہی اصول کارفرما ہے۔

کیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتمام حجت صرف جزیرۂ عرب تک محدود تھا؟

ایک سوال یہ ہے کہ ''کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتمامِ حجت کا مشن صرف جزیرۂ عرب تک محدود تھا؟ کیونکہ آپ کو زندگی میں غلبہ صرف جزیرۂ عرب کی حد تک ہی ملا۔ یہ غلبہ بھی عارضی تھا اور آپ کی وفات کے ساتھ ہی

عرب میں ارتداد کی لہر پھیل گئی جس پر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی قابو پا سکے تھے اور مولانا اصلاحی کی اختیار کردہ تاویل کے مطابق سورۂ توبہ کی آیت 'فَاِنۡ تَابُوۡا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَخَلُّوۡا سَبِیۡلَہُمۡ' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان 'أمرت أن أقاتل الناس' کا عملاً نفاذ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ارتداد کی جنگ کے موقع پر ہی کیا۔ تو جب جزیرۂ عرب میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غلبہ آپ کے بعد ہی مستحکم ہوا تو وہ اتمامِ حجت کے بعد رسول کے غلبے کی بات کیا ہوئی؟''

قرآن مجید کی یہ آیت اس پر شاہد ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت خصوصیت سے بنی اسمٰعیل کے لیے تھی، اور پھر بنی اسمٰعیل کی بعثت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی نسبت سے باقی دنیا کے لیے ہے:

وَ کَذٰلِکَ جَعَلۡنٰکُمۡ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوۡنُوۡا شُہَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَیۡکُمۡ شَہِیۡدًا. (البقرہ ۲:۱۴۳)

''(ہم نے یہی کیا ہے) اور (جس طرح مسجد حرام کو تمھارا قبلہ ٹھیرایا ہے)، اِسی طرح ہم نے تمھیں بھی ایک درمیان کی جماعت بنا دیا ہے تاکہ تم دنیا کے سب لوگوں پر (حق کی) شہادت دینے والے بنو اور اللہ کا رسول تم پر یہ شہادت دے۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

معلوم ہونا چاہیے کہ رسول کے ذریعے سے کسی خطے کے ایک خاص مرکزی شہر میں ایک نشانِ حق قائم کرنا مقصود ہوتا ہے:

وَمَا کَانَ رَبُّکَ مُہۡلِکَ الۡقُرٰی حَتّٰی یَبۡعَثَ فِیۡۤ اُمِّہَا رَسُوۡلًا یَّتۡلُوۡا عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتِنَا. (القصص ۲۸:۵۹)

''حقیقت یہ ہے کہ تیرا پروردگار اِن بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہیں تھا، جب تک اِن کے مرکز میں کسی رسول کو نہ بھیج لے جو ہماری آیتیں اِنھیں پڑھ کر سنا دے۔''

یہ نشان حق رسول کے مخالفین کی مغلوبیت کا نام ہے۔ خطے کے ہر ہر شہر اور بستی میں اسے دہرایا نہیں جاتا۔ موسیٰ علیہ السلام کی سرگذشت میں بھی یہ اصول دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ نشانِ حق مصر کے دارالحکومت میں قائم ہوا تھا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت ام القریٰ مکہ اور قریب کے مرکزی علاقے تھے جہاں یہ نشان حق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین کی مغلوبیت اور آپ کے غلبے کی صورت میں ظاہر ہوا۔ خدا کا وعدہ پورا ہو گیا کہ اس کے رسول ہمیشہ غالب رہتے ہیں۔ یہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ رسول کے غلبے سے محض سیاسی غلبہ مراد نہیں ہوتا، جیسا کہ پہلے

مفصل بحث گزر چکی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت، البتہ خدا کی یہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سیاسی غلبے کی صورت میں سامنے آئی۔ رسول کا غلبہ منکرین کی مغلوبیت کا نام ہے، جس کا اظہار منکرین پر دنیوی عذاب کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس عذاب کو مکمل طور پر برپا ہوتے ہوئے دیکھنا بھی رسول کے لیے ضروری نہیں، جیسا کہ قرآن مجید میں بتایا گیا تھا کہ آپ اس دنیوی عذاب کے نازل ہونے سے پہلے دنیا سے رخصت بھی ہو سکتے تھے۔ تاہم، آپ نے اپنے منکرین کی مغلوبیت اپنی زندگی میں ہی دیکھ لی اور رسولوں سے متعلق خدا کی سنت کا ظہور ہو گیا۔ اس کے بعد جو ہوا، وہ ذریت ابراہیم، یعنی اس کی دوسری شاخ بنی اسمٰعیل کے غلبے کی داستان ہے۔ سیاسی غلبے کا وعدہ اصلاً ذریت ابراہیم سے ہے۔ بنی اسمٰعیل کے غلبے کا آغاز بھی البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کرا دیا گیا، کیونکہ آپ ہی اس وقت بنی اسمٰعیل کے سربراہ بھی تھے۔

رہی یہ بات کہ آپ کی وفات کے فوراً بعد جزیرۂ عرب میں ارتداد پھیل گیا اور آپ کا غلبہ ختم ہو گیا تو جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ رسول کے لیے سیاسی غلبہ قائم ہونا ضروری نہیں۔ دوسرے یہ کہ رسول کے بعد حالات کی تبدیلی سے یہ حقیقت نہیں بدل جاتی کہ رسول کے ذریعے سے حق کا غلبہ قائم ہوا تھا۔ جس طرح موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے سے قائم ہونے والا نشان حق بنی اسرائیل کی گمراہیوں کے باوجود آج بھی اپنی جگہ قائم اور نمونۂ عبرت ہے، اسی طرح قرآن مجید، تاریخ اور سیرت میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلبۂ حق کی سرگذشت محفوظ ہو کر قیامت تک کے لیے ایک نمونۂ عبرت کے طور پر قائم ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ذریت ابراہیم کے رسولوں کے ساتھ معاملہ یوں ہوا کہ نشان حق قائم ہو جانے کے بعد، باقی کا سیاسی غلبہ ذریت ابراہیم کرتی تھی، جیسا کہ ان سے خدا کا وعدہ تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کے خلفا نے باقی کا غلبہ پورا کیا تھا، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفا کے ہاتھوں عرب اور بیرون عرب غلبے کا وعدہ پورا ہوا۔

اتمام حجت تو ممکنہ حد تک انفرادی طور پر ہوا، لیکن اس کی سزا کا نفاذ اجتماعی طور پر ہوا

یہ بات مدنظر رہنی چاہیے کہ خدا کی طرف سے اقوام کے بارے میں فیصلے ان کے انفرادی رویوں کی بنیاد پر نہیں، بلکہ اجتماعی رویوں کے لحاظ سے کیے جاتے ہیں۔ مثلاً خدا فرماتا ہے:

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ. (ہود ۱۱: ۱۱۷)	”(اے پیغمبر)، تیرا پروردگار ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو (اُن کے) کسی ظلم کی پاداش میں ہلاک کر دے،

جب کہ اُن کے باشندے اصلاح کرنے والے ہوں۔‘‘

یہ معلوم ہے کہ کسی صالح ترین معاشرے میں بھی سارے کے سارے ہی مصلح اور نیک نہیں ہوتے۔ اس آیت سے مراد ایسا سماج ہے جہاں افراد کی ایک قابل لحاظ تعداد اصلاح میں مصروف ہو، جن کے اثرات اجتماعی طور پر ظاہر ہو رہے ہوں تو اس سماج کے دیگر افراد کے مظالم کے باوجود خدا انھیں تباہ نہیں کرتا۔ لیکن اصلاح کرنے والے اگر اس قابل نہ ہو پائیں کہ اجتماعی دھارے کو متاثر کر سکیں تو پھر چاہے وہ مصلح نبی اور رسول ہی کیوں نہ ہوں، خدا اس قوم کی اجتماعی نالائقی کی بنا پر ان کو بالآخر تباہ کر دیتا ہے۔ اسی قانون کو قرآن مجید میں ایک اور طرح سے یوں بیان کیا گیا ہے:

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمۡ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعۡمَةً اَنۡعَمَهَا عَلٰى قَوۡمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِهِمۡ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ. (الانفال ۸:۵۳)

’’یہ اِس وجہ سے ہوا کہ اللہ کسی نعمت کو جو اُس نے کسی قوم کو عطا کی ہو، اُس وقت تک نہیں بدلتا، جب تک وہ اپنے آپ میں تبدیلی نہ کریں۔ (نیز) اِس وجہ سے کہ اللہ سمیع و علیم ہے۔‘‘

یہ بھی کبھی ممکن نہیں ہوا کہ کسی بدترین معاشرے میں سب کے سب ہی گناہ گار ہوں۔ کوئی بھی سماج کتنا ہی برا کیوں نہ ہو، اس میں کچھ اچھے اور کچھ بہت اچھے لوگ بھی ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن مجموعی حالت اگر ناقابل اصلاح ہو جائے تو چند نیک صفت لوگوں کی وجہ سے خدا اس قوم کی خرابی کا فیصلہ بدلتا نہیں ہے۔

اس کی ایک اور مثال یہود ہیں۔ یہود پر بہ حیثیت قوم لعنت کی گئی تھی، حالاں کہ اللہ تعالیٰ کو یہ بھی تسلیم تھا کہ ان میں کچھ بہت اعلیٰ صفات کے حامل لوگ بھی موجود تھے جن کی تعریف قرآن مجید میں متعدد مقامات پر کی گئی ہے۔ لیکن ان پر لعنت کا فیصلہ ان کی مجموعی حالت کے پیش نظر کیا گیا تھا۔

اسی کلیہ کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ رسولوں کے ذریعے سے اتمام حجت تو ممکنہ حد تک انفرادی اور اجتماعی، دونوں سطح پر ہوا، لیکن رسول کے انکار کے بعد دنیوی سزا کے نفاذ کا فیصلہ قوم کے مجموعی رویے کی بنا پر ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے افراد کی موجودگی کا امکان تھا کہ ان کو مزید سمجھانے کی ضرورت ہو سکتی تھی، لیکن وہ بھی اس اجتماعی فیصلے کا شکار ہوئے۔ اب ایسے افراد کا معاملہ آخرت میں دیکھا جائے گا، اگر وہ رعایت کے مستحق ہوں گے تو خدا کی طرف سے رعایت مل جائے گی، مگر دنیا کی ناگزیر محدودیت میں اتنا ہی ممکن تھا۔

اتمام حجت کے بعد خدا کی طرف سے آنے والے دنیوی عذاب کی دونوں صورتوں میں یہی اصول کارفرما رہا کہ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

منکرین کا فیصلہ ان کے اجتماعی رویے کی بنا پر کیا گیا۔ چنانچہ عذاب جب قدرتی طاقتوں — ہوا، پانی اور زلزلہ وغیرہ — کے ذریعے سے دیا گیا تو وہاں بھی اس بات کا پورا امکان ہے کہ ان منکرین کے ساتھ ان کے معصوم بچے، کم عقل اور فاتر العقل افراد بھی ضرور مارے گئے ہوں گے۔ ان میں شاید ایسے بھی ہوں جن کو مزید سمجھانے کی ضرورت ہو۔ عذاب سے پہلے جس طرح مومنین کو بچا لے جایا گیا، اس طرح کفار کی قوم میں سے ایسے افراد کو بچانا ممکن نہ ہو سکا، کیونکہ وہ اپنی قوم سے علیحدہ نہ ہو سکے تھے۔ ان کے حق میں وہ عذاب محض موت کا سبب بنا، اور موت تو آنی ہی تھی، جب کہ اجتماعی لحاظ سے وہ منکرین کی قوم پر عذاب اور نشان حق بن گیا۔

محمد رسول اللہ کے وقت جب دنیوی عذاب، صحابہ کی تلواروں کی صورت میں ظاہر ہوا تو اس عذاب کی نوعیت کی وجہ سے معصوم بچوں، اور دوسرے غیر مکلّف افراد حتیٰ کہ منکرین کی خواتین تک کو بچا لینا ممکن ہو گیا۔ چنانچہ خواتین کو قتل نہیں کیا گیا، اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ اس وقت کے سماج کی خواتین اپنے مردوں اور خاندانوں کے تابع تھیں۔ ان کی الگ خود مختارانہ حیثیت نہیں تھی۔ ان کا انکار حق بھی اپنے خاندان کے تابع تھا، اور اسلام کے غلبہ پا جانے کے بعد، ان کے خاندانوں کے ممکنہ طور پر مٹ جانے یا اسلام قبول کر لینے (حقیقتاً قبول اسلام ہی ہوا) کے بعد خود ان کا ایمان قبول کر لینا واضح تھا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

بہر حال، عذاب کی اس صورت میں بھی مسلمانوں کے خلاف اپنی قوم کا ساتھ دینے والوں میں ایسے افراد کا امکان رد نہیں کیا جا سکتا جن کو خدا کے اس آخری فیصلے کے بعد بھی مزید سمجھانے کی ضرورت رہ گئی ہو گی۔ خود قرآن میں ہی بیان ہوا ہے کہ عین اس وقت جب مشرکین کے خلاف آخری اعلان جنگ کر دیا گیا، اس وقت بھی یہ ہدایت دی گئی کہ:

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ. (التوبہ ۹:۶)

''اور اگر (اِس دارو گیر کے موقع پر) اِن مشرکوں میں سے کوئی شخص تم سے امان چاہے (کہ وہ تمھاری دعوت سننا چاہتا ہے) تو اُس کو امان دے دو، یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔ پھر اُس کو اُس کے مامن تک پہنچا دو۔ یہ اِس لیے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو (خدا کی باتوں کو) نہیں جانتے۔''

تاہم، خدا کی طرف سے جنگ کا اعلان قوم کے اجتماعی رویے کے لحاظ سے کر دیا گیا۔ اب گیہوں کے ساتھ جو

گھن بھی پس گیا، اس کا فیصلہ آخرت کی عدالت میں پورے عدل سے کیا جائے گا۔

اسی کلیے کا اطلاق روم و ایران کی اقوام کے خلاف صحابہ کی جنگوں پر بھی کیا جا سکتا ہے۔ اپنی قومی حیثیت میں انھوں نے صاف طور پر بتا دیا تھا کہ وہ اسلام کے پیغام پر کبھی لبیک کہنے والے نہیں۔ بہ حیثیت قوم ان پر یہ بھی عیاں ہو چکا تھا کہ عرب میں اسلام کے ظہور اور غلبہ کی ایسی تبدیلی ایک غیر معمولی واقعہ تھا جو ان کے لیے اتمام حجت کا سبب بن گیا۔ لیکن عام آدمیوں میں ہم ایسے لوگوں کے وجود کے امکان کو رد نہیں کر سکتے جو 'بِاَنَّھُمْ قَوْمٌ لَّا یَعْلَمُوْنَ' (یہ ایسے لوگ ہیں جو (خدا کی باتوں کو) نہیں جانتے) کے زمرے میں آتے ہیں۔ تاہم جنگ قومی سطح پر ہونی تھی، سو وہ ہو کر رہی۔ ان اقوام کے ایسے افراد کا معاملہ آخرت کی عدالت میں دیکھا جائے گا۔

روم و ایران پر اتمامِ حجت اور صحابہ کی جنگی مہمات

روم و ایران پر اتمام حجت کے حوالے سے ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ ''کیا قیصر و کسریٰ اور دیگر اقوام پر بھی اتمامِ حجت کیا گیا؟ اگر ہاں تو کیسے؟ اور اگر نہیں تو پھر ان کے خلاف صحابۂ کرام کی جنگوں کو اتمامِ حجت کے ''قانون'' میں کیسے فٹ کیا جا سکتا ہے؟''

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

اس پر مکرر عرض ہے کہ اتمام حجت کے ذریعے سے قائم کیا جانے والا نشان حق کسی ایک مرکزی علاقے میں اپنے تمام مراحل کے ساتھ برپا کیا جاتا ہے۔ ہر قوم کے لیے ہر دفعہ نئے سرے سے اس کا اعادہ نہیں کیا جاتا۔ نہ صرف روم و ایران، بلکہ جزیرۂ عرب کے بھی تمام علاقوں پر اس طرح اتمام حجت نہیں کیا گیا، جیسا مکہ میں ہوا۔

اتمام حجت کے وقت، عرب کے دیگر قبائل اور بیرون عرب ہمسایہ اقوام کے لیے رسول کے ذریعے سے برپا ہونے والا یہ واقعہ آنکھوں دیکھی بات کی طرح تھا، جو ان کے لیے اتمام حجت کا سبب بنا۔ جیسے ہمارے وقت میں ہمارے لیے متحدہ ریاست ہاے امریکا کے شہر نیویارک میں سن دو ہزار ایک میں نو گیارہ کا سانحہ ایک غیر معمولی واقعہ ہے، جس سے ہم براہ راست متاثر ہوئے۔ یہ دیگر تاریخی واقعات میں سے ایک تاریخی واقعہ بننے سے پہلے ہمارے لیے ہمارے دور کا واقعہ ہونے کی وجہ سے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ بنی اسمٰعیل کا غلبہ جزیرۂ عرب میں جب ہوا تو اہل روم و ایران کے عمائدین اور عوام کے علم میں یہ بات آ گئی اور وہ اس سے اسی طرح متاثر ہوئے، جیسے اپنے وقت کے کسی غیر معمولی واقعہ سے متاثر ہوا جاتا ہے۔ ان کے حق میں یہی اتمام حجت تھا۔ جس طرح قریش کو قوم نوح، قوم صالح، قوم عاد، اور قوم لوط وغیرہ پر رسولوں کے اتمام حجت اور اس کے نتائج کی سرگذشت سنا کر اتمام حجت کیا گیا،

اسی طرح عرب کے مرکزی علاقوں میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے اتمام حجت اور اس کے نتائج کے ظہور کی سرگذشت اس وقت کی دیگر اقوام کے لیے اتمام حجت کا ذریعہ بنی۔

یہ معلوم ہے کہ روم و ایران کی خبریں عرب میں بھی زیر بحث رہتی تھیں، جیسا کہ سورۂ روم سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس لیے قومی سطح پر ایسے واقعات کو معمول کے واقعے سمجھا نہیں جا سکتا اور نہ یہ سمجھنا درست ہے کہ اس وقت کی قومیں ایک دوسرے کے ہاں قومی سطح کی تبدیلیوں اور ان کے مضمرات سے بے خبر ہوا کرتی تھیں۔

یہی وجہ تھی کہ صحابہ جنگ سے پہلے عرب قبائل اور اہل روم و ایران کو قبولِ اسلام کی اجمالی دعوت دیتے تھے، کیونکہ تفصیلات ان کے مخاطبین کے علم میں تھیں۔ یعنی ایسا نہیں تھا کہ محض سرحد پر کھڑے کھڑے اسلام قبول کرنے کی واجبی سی دعوت دے دی جاتی تھی اور سمجھ لیا جاتا تھا کہ اتمام حجت کا فرض ادا ہو گیا۔ بادشاہوں کے نام آپ کے خطوط میں بھی اسلام قبول کرنے کی دعوت بالکل اجمالی انداز میں ہوا کرتی تھی، مگر ان بادشاہان کے ردعمل سے صاف ظاہر ہے کہ وہ جانتے تھے کہ کن بنیادوں پر اور کن نتائج کے لحاظ سے ان سے قبول اسلام کا مطالبہ کیا گیا تھا، یعنی کہ انکار کی صورت میں ان کے ساتھ بھی وہی ہونا تھا جو جزیرۂ عرب میں برپا ہوا تھا۔ ان اجمالی دعوتوں کے پیچھے پوری تاریخ ہے، جس پر نظر نہ ہونے کی وجہ سے غلط نتائج نکالے گئے۔ مولانا عمار خان ناصر اپنی کتاب ''جہاد: ایک مطالعہ'' میں لکھتے ہیں:

''...رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان خطوط کو ہمارے اہل سیرت بالعموم 'دعوتی خطوط' کا عنوان دیتے ہیں، حالانکہ ان کے مضمون اور پیش وعقب کے حالات سے واضح ہے کہ ان میں مخاطبین کو محض سادہ طور پر اسلام کی دعوت نہیں بلکہ یہ وارننگ دی گئی تھی کہ ان کے لیے سلامتی اور بقا کا راستہ یہی ہے کہ وہ اس دعوت کو قبول کر لیں، بصورت دیگر انھیں اپنی حکومت و اقتدار سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ مثال کے طور پر قیصر روم کے نام خط میں آپ نے لکھا: 'اسلم تسلم'۔

نووی اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

ان قوله "اسلم تسلم" فی نهایة من الاختصار وغایة من الاعجاز والبلاغة وجمع المعانی مع ما فیه من بدیع التجنیس وشموله لسلامته من خزی الدنیا بالحرب والسبی والقتل واخذ الدیار والاموال ومن عذاب الآخرة. (شرح مسلم، ص۱۱۴۴)

''اسلم تسلم کا جملہ بے حد مختصر لیکن غایت درجہ بلاغت و اعجاز کا حامل اور متنوع معانی پر محیط ہے۔ اس میں 'تجنیس' کی صنعت بھی بہت عمدہ طریقے سے استعمال ہوئی ہے اور 'تسلم' کے لفظ میں جنگ، قید، قتل اور اموال و دیار کے چھین لیے جانے کی صورت میں دنیا کی رسوائی اور آخرت کے عذاب، دونوں سے بچاؤ کا مفہوم شامل

ہے۔‘‘‘‘(۶۸)

’’ان بادشاہان کے ردعمل سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ان خطوط کو صرف دعوتی خط نہیں سمجھا تھا۔ کسریٰ نے تو نامۂ مبارک ہی چاک کرڈالا تھا۔ حارث بن ابی شمر غسانی کو آپ نے لکھا تھا کہ ایک اللہ پر ایمان لے آؤ تمھاری بادشاہت برقرار رہے گی۔ جواب میں اس نے کہا کہ مجھ سے میری بادشاہت کون چھین سکتا ہے۔ میں اس پر یلغار کرنے والا ہوں۔‘‘(ابن سید الناس الیعمری، عیون الاثر ۲/۳۳۹)

اسی طرح قیصر نے کہہ دیا تھا کہ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات نہ مانی تو اس کا پایۂ تخت ایک دن ان کے قدموں تلے ہوگا:

يا معشر الروم هل لكم في الفلاح والرشد وأن يثبت ملككم فتبايعوا هذا النبي؟ (بخاری، رقم ۷)	’’اے جماعت روم، کیا تم اس بات کی خواہش رکھتے ہو کہ تمھیں کامیابی اور ہدایت نصیب ہو اور تمھاری سلطنت قائم رہے اور تم اس نبی کی پیروی قبول کرلو؟‘‘

مولانا عمار خان ناصر لکھتے ہیں کہ

’’امام ابوعبید کی روایت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خط میں قیصر کو اسلام قبول نہ کرنے کی صورت میں جزیہ ادا کرنے کا حکم بھی دیا۔ آپ نے فرمایا:

انی ادعوك الى الاسلام فان اسلمت فلك ما للمسلمين وعليك ما عليهم فان لم تدخل فی الاسلام فاعط الجزية فان اللّٰه تبارك وتعالٰی يقول: قاتلوا الذين ..... حتى يعطوا الجزية عن يد وهم صاغرون والا فلا تحل بين الفلاحين وبين الاسلام ان يدخلوا فيه او يعطوا الجزية.

(الاموال ۹۳)

’’میں تمھیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اگر اسلام لے آؤ گے تو تمھارے حقوق وفرائض وہی ہوں گے جو مسلمانوں کے ہیں اور اگر اسلام میں داخل نہ ہونا چاہو تو پھر جزیہ ادا کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اہل کتاب سے قتال کرو.... یہاں تک کہ وہ زیردست ہو کر پستی کی حالت میں جزیہ ادا کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ اور اگر یہ بھی نہیں تو پھر اس بات میں رکاوٹ نہ ڈالو کہ اہل روم اسلام میں داخل ہو جائیں یا جزیہ ادا کریں۔‘‘‘‘(۷۰)

یہی وجہ ہے کہ ایران کے کسریٰ نے بھی اسے ہلکا نہ لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گرفتار کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ چنانچہ ایسا نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف خط لکھنے سے اتمام حجت ہو گیا تھا، سارا معاملہ ان کے سامنے تھا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

دوسری بات یہ کہ صحابہ نے ان کے سامنے شرائط بھی وہی رکھیں تھیں جو جزیرۂ عرب کے اہل کتاب کے سامنے رکھی گئی تھیں اور سزا بھی وہی تجویز کی جو جزیرۂ عرب کے اہل کتاب پر نافذ کی گئی تھی۔اس سے بھی یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ معاملہ بھی اسی اصول کی روشنی میں طے ہوا جس اصول کے تحت عرب کے اہل کتاب، جن پر اتمام حجت ہوا تھا، سے معاملہ کیا گیا تھا۔

یہ صحابہ کا اجتہادی فیصلہ تھا کہ انھوں نے جزیرۂ عرب میں ہونے والے اتمام حجت کے معاملے کو روم وایران تک پھیلا دیا۔تاہم، اس سلسلے میں ان کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے فتح ونصرت کی بشارتیں بھی موجود تھیں، جن سے ان کے اجتہاد کو تقویت ملی ہو گی۔

صحابہ کی ان جنگوں کی سیاسی اور سماجی تاویلات اور تشریحات بھی کی گئی ہیں، لیکن ہم ان جنگ کے فریق صحابہ کے اپنے بیانات کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں جو ان جنگوں کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر بیان کر رہے ہیں۔یہی ہمارے لیے حجت ودلیل بن سکتا ہے نہ کہ ہماری یا کسی اور کی تاویل۔مولانا عمار خان ناصر صاحب اپنی کتاب ''جہاد: ایک مطالعہ'' میں لکھتے ہیں:

''سیدنا ابوبکر نے اہل روم کے خلاف جہاد میں شرکت کی ترغیب دینے کے لیے اہل یمن کو خط لکھا تو اس میں فرمایا:

ان اللّٰہ کتب علی المومنین الجہاد وامرھم ان ینفروا خفافا وثقالا .... ولا یترك اھل عداوته حتی یدینوا الحق ویقروا بحکم الکتاب او یودوا الجزیة عن ید وھم صاغرون.

(ازدی، فتوح الشام ۵،۶)

''اللہ نے اہل ایمان پر جہاد فرض کیا ہے اور انھیں حکم دیا ہے کہ ہلکے ہوں یا بھاری، جہاد کے لیے نکلیں۔اس دین کے دشمنوں کو اس وقت تک نہیں چھوڑا جا سکتا جب تک کہ وہ اس دین کی پیروی اختیار کر کے کتاب اللہ کے حکم پر راضی نہ ہو جائیں یا پھر مطیع بن کر ذلت اور پستی کی حالت میں جزیہ ادا کرنا قبول نہ کر لیں۔''''(۷۵)

''مسلمانوں کے لشکر نے ابوعبیدہ بن جراح کی قیادت میں شام کے علاقے اُردن کا محاصرہ کیا تو اہل روم کے ساتھ گفت وشنید کے دوران میں ان کی طرف سے یہ پیش کش کی گئی کہ وہ بلقاء اور اُردن کا کچھ علاقہ اس شرط پر مسلمانوں کو دے دیتے ہیں کہ وہ ان کے ساتھ صلح کر لیں اور شام کے باقی علاقوں کو رومیوں سے چھیننے کی کوشش نہ کریں۔اس کے جواب میں ابوعبیدہ نے ان سے کہا:

امرنا صلی اللّٰہ علیه وسلم فقال اذا اتیتم المشرکین فادعوھم الی الایمان باللّٰہ وبرسوله

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

وبالاقرار بما جاء من عند اللّٰہ عز وجل فمن آمن وصدق فھو اخوکم فی دینکم لہ ما لکم وعلیہ ما علیکم ومن ابی فاعرضوا علیہ الجزیۃ حتی یودونھا عن ید وھم صاغرون فان ابوا ان یومنوا او یودوا الجزیۃ فاقتلوھم وقاتلوھم. (ازدی، فتوح الشام ۱۰۹)

''ہمیں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ جب تم مشرکین کے پاس جاؤ تو انھیں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے اور جو کچھ اللہ کا رسول اللہ کی طرف سے لے کر آیا ہے، اس کا اقرار کرنے کی دعوت دو۔ پھر جو ایمان لے آئے اور تصدیق کر دے، وہ دین میں تمھارا بھائی ہے۔ اس کے حقوق وفرائض وہی ہیں جو تمھارے ہیں۔ اور جو انکار کرے تو اسے جزیہ ادا کرنے کے لیے کہو یہاں تک کہ وہ مطیع بن کر ذلت کی حالت میں جزیہ دینے پر آمادہ ہو جائیں۔ پھر اگر وہ ایمان لانے اور جزیہ دینے سے انکار کریں تو انھیں قتل کرو اور ان کے خلاف جنگ کرو۔''

عمرو بن العاص نے شاہِ مصر مقوقس کے نمائندوں سے کہا:

ان اللّٰہ عز وجل بعث محمدا صلی اللّٰہ علیہ وسلم بالحق وامرہ بہ وامرنا بہ محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم وادی الینا کل الذی امر بہ ثم مضی صلوات اللّٰہ علیہ ورحمتہ وقد قضی الذی علیہ وترکنا علی الواضحۃ وکان مما امرنا بہ الاعذار الی الناسفنحن ندعوکم الی الاسلام فمن اجابنا الیہ فمثلنا ومن لم یجبنا عرضنا علیہ الجزیۃ وبذلنا لہ المنعۃ.

(طبری، تاریخ الامم والملوک ۴/ ۱۰۷)

''اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دین حق دے کر بھیجا اور ان کو اس کی پیروی پر مامور کیا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے تمام حکم ہم تک پہنچا دیے اور ہمیں ان کی پیروی کی تلقین کی۔ پھر آپ اپنی ذمہ داری ادا کرنے کے بعد اللہ کے حضور تشریف لے گئے اور ہمیں ایک نہایت روشن راستے پر چھوڑ گئے۔ انھوں نے ہمیں جو حکم دیے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ لوگوں پر اس طرح حجت قائم کر دیں کہ ان کے پاس عذر باقی نہ رہے۔ پس اب ہم تمھیں اسلام کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ جو اسے قبول کر لے گا، وہ ہمارا شریک بن جائے گا اور جو انکار کرے گا، ہم اسے یہ پیش کش کریں گے کہ وہ جزیہ ادا کرے اور (بدلے میں) اس کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہو گی۔'''' (۸۲)

صحابہ نے یہ معاملہ اگر اتمام حجت کی رو سے نہیں کیا، تو کیا وجہ تھی کہ انھوں نے روم وایران کے سپہ سالاروں کی طرف سے کسی صلح کی پیش کش کو قبول نہیں کیا، حالاں کہ طاقت کے اعتبار سے صحابہ اپنے مقابل سے کمزور تھے، اور قرآن کا حکم بھی ان کے سامنے تھا کہ اگر دشمن صلح کی طرف مائل ہو تو صلح کر لو:

وَاِنۡ جَنَحُوۡا لِلسَّلۡمِ فَاجۡنَحۡ لَهَا وَ تَوَكَّلۡ ''یہ لوگ اگر صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی اِس کے

عَلَی اللّٰہِ اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ. (الانفال ۸:۶۱) لیے جھک جاؤ اور اللہ پر بھروسا رکھو۔ بے شک، وہ سننے والا، جاننے والا ہے۔''

پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ یہ جنگیں صحابہ نے تب تک جاری رکھیں جب تک وہ ان سرحدوں تک نہ پہنچ گئے جن تک پہنچنے کی بشارت ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ملی تھیں جو حضرت عمر کے دور خلافت میں فتح ہو گئی تھیں۔ پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ دشمن کو مغلوب کر لینے اور ان سے زیادہ طاقت ور ہو جانے کے بعد اور ان کی طرف سے سازشوں اور شورشوں کے خطرے کے باوجود وہ ان مخصوص سرحدوں سے آگے بڑھنے کے لیے تیار نہ ہو رہے تھے اور وہ مقابلے کی بہتر پوزیشن میں بھی تھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عمر نے اپنے آخری دور کی جنگیں بہ امر مجبوری لڑیں تا کہ دشمن کی کمر توڑی جا سکے اور وہ حملے کرنے بند کر دے۔ مولانا عمار خان ناصر ''جہاد: ایک مطالعہ'' میں لکھتے ہیں:

''قادسیہ، مدائن اور جلولاء کے معرکوں کے بعد ۱۶ ہجری میں جنوبی عراق کا علاقہ، جس کو عرب مورخین 'سواد' کے نام سے یاد کرتے ہیں، مسلمانوں کے قبضے میں آ چکا تھا۔ سعد بن ابی وقاص نے مزید پیش قدمی کی اجازت چاہی تو سیدنا عمر نے انھیں اس سے روک دیا۔

وکتبوا الی عمر بفتح جلولاء وبنزول القعقاع حلوان واستاذنوه فی اتباعهم فابی وقال لوددت ان بین السواد وبین الجبل سدا لا یخلصون الینا ولا نخلص الیهم حسبنا من الریف السواد انی آثرت سلامة المسلمین علی الانفال. (تاریخ الامم والملوک ۴/۲۸)

''انہوں نے سیدنا عمر کو خط لکھ کر جلولاء کے فتح ہونے کی خبر دی اور بتایا کہ قعقاع حلوان کے مقام پر مقیم ہیں۔ نیز انہوں نے دشمن کا پیچھا کرنے کی اجازت مانگی لیکن سیدنا عمر نے انکار کر دیا اور کہا کہ میری یہ خواہش ہے کہ سواد اور جبل کے علاقے کے درمیان کوئی ایسی رکاوٹ کھڑی ہو جائے جس کو عبور کر کے نہ وہ ہماری طرف آ سکیں اور نہ ہم ان کی طرف جا سکیں۔ ان شاداب خطوں میں سے ہمارے لیے سواد ہی کافی ہے۔ مجھے مال غنیمت کے مقابلے میں مسلمانوں کی سلامتی زیادہ عزیز ہے۔'''' (۱۱۸)

''طبری لکھتے ہیں:

وقد قال عمر حسبنا لاهل البصرة سوادهم والاهواز وددت ان بیننا وبین فارس جبلا من نار لا یصلون الینا منه ولا نصل الیهم کما قال لاهل الکوفة وددت ان بینهم وبین الجبل جبلا من نار لا یصلون الینا منه ولا نصل الیهم. (تاریخ الامم والملوک ۴/۷۹)

''سیدنا عمر نے کہا: ہم اہل بصرہ کے لیے سواد اور اہواز کا علاقہ کافی ہے۔ کاش ہمارے اور فارس کے علاقے کے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

درمیان آگ کا کوئی پہاڑ ہوتا۔ نہ وہ ہم تک پہنچ پاتے اور نہ ہم ان تک پہنچ پاتے۔ اسی طرح آپ نے اہل کوفہ کے بارے میں کہا تھا کہ کاش ان کے اور جبل کے علاقے کے مابین آگ کا کوئی پہاڑ ہوتا۔ نہ وہ اس طرف آ سکتے اور نہ ہم ادھر جا سکتے۔''''(۱۲۱)

''فارس کے علاقے میں عام لشکرکشی کی اجازت سیدنا عمر نے ۱۷ ہجری میں احنف بن قیس کی تجویز پر دی۔

يا امير المومنين اخبرك انك نهيتنا عن الانسياح فى البلاد وامرتنا بالاقتصار على ما فى ايدينا وان ملك فارس حى بين اظهرهم وانهم لا يزالون يساجلوننا ما دام ملكهم فيهم ولم يجتمع ملكان فاتفقا حتى يخرج احدهما صاحبه وقد رايت انا لم ناخذ شيئا بعد شئ الا بانبعاثهم وان ملكهم هو الذى يبعثهم ولا يزال هذا دابهم حتى تاذن لنا فلنسح فى بلادهم حتى نزيله عن فارس ونخرجه من مملكته وعز امته فهنالك ينقطع رجاء اهل فارس ويضربون جاشا.

(طبری، تاریخ الامم والملوک ۸۹/۴)

''اے امیر المومنین! میں آپ کو اصل بات بتاتا ہوں۔ آپ نے ہمیں مملکت فارس میں دور تک گھسنے سے منع کر رکھا ہے اور ان علاقوں پر اکتفا کرنے کا حکم دیا ہے جو ہمارے قبضے میں ہیں، جبکہ اہل فارس کا بادشاہ زندہ سلامت ان کے مابین موجود ہے اور جب تک وہ رہے گا، اہل فارس ہمارے ساتھ آمادۂ پیکار رہیں گے۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ ایک سرزمین میں دو بادشاہ اتفاق سے رہیں۔ ان میں سے ایک کو لازماً دوسرے کو نکالنا پڑے گا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہمیں اہل فارس کی بغاوتوں ہی کے نتیجے میں ایک کے بعد دوسرے علاقے پر قبضہ کرنا پڑا ہے اور ان تمام بغاوتوں کا سرچشمہ ان کا بادشاہ ہے۔ ان کا وتیرہ یہی رہے گا جب تک کہ آپ ہمیں اجازت نہیں دیتے کہ ہم ان کی مملکت میں گھس کر ان کے بادشاہ کو وہاں سے ہٹا دیں اور اس کی سلطنت اور سربلندی کی جگہ سے اس کو نکال دیں۔ اس صورت میں اہل فارس کی امیدیں ٹوٹ جائیں گی اور وہ پرسکون ہو جائیں گے۔''''(۱۲۳)

اسی طرح حضرت عمر ممکنہ شورشوں اور بغاوتوں کے باوجود مصر، افریقہ اور ہندوستان پر حملہ آور ہونے سے گریزاں رہے۔ نیز ترکوں اور اہل حبشہ سے بھی جنگ کرنے سے اجتناب برتتے رہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے لڑنے میں پہل کرنے سے منع فرمایا تھا۔ مولانا عمار خان ناصر لکھتے ہیں:

''مذکورہ پالیسی کی پابندی کے معاملے میں سب سے زیادہ سخت اور بے لچک رویہ سیدنا عمر کا تھا اور ان کی نسبت سے اس کی معنویت اس تناظر میں بالخصوص دوچند ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض پیش گوئیوں کی بنا پر وہ اس بات سے اچھی طرح واقف تھے کہ ان کی وفات سے مسلمانوں کی قوت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا اور

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ان کی قوت وشدت اندر کا رخ کر کے مسلمانوں کے باہمی قتل وقتال کی شکل اختیار کر لے گی۔ ایک موقع پر انھوں نے فرمایا:

واللّٰہ لا یفتح بعدی بلد فیکون فیه کبیر نیل بل عسی ان یکون کلا علی المسلمین.

(ابو یوسف، الخراج، ص ۲۶)

''بخدا، میرے بعد کوئی علاقہ ایسا فتح نہیں ہوگا جس سے مسلمانوں کو کوئی بڑا فائدہ حاصل ہو، بلکہ الٹا اس بات کا خدشہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے لیے بوجھ بن جائے۔''

...رومی اور فارسی سلطنتوں کے خلاف جنگ کی اجازت حاصل ہونے کے باوجود وہ ان کے تمام علاقوں پر قبضہ نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ ان کے پیش نظر اصلاً صرف شام اور عراق کے علاقے تھے اور وہ ان سے آگے بڑھنا نہیں چاہتے تھے۔'' (۱۳۶)

اس سے ہم یہ نتیجہ نکالنے میں خود کو حق بجانب محسوس کرتے ہیں کہ حضرت عمر کے وقت تک وہ تمام علاقے مسلمانوں کے زیرنگیں آ گئے تھے، جہاں اتمام حجت کے نتیجے میں محکومی کی سزا کا نفاذ اللہ اور رسول کا منشا تھا۔ اس کے بعد جو علاقے فتح ہوئے، وہ سیاسی معاملات ہیں، ان کا اتمام حجت سے کوئی تعلق نہیں۔ اتمام حجت وہاں تک کارفرما تھا جہاں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آپ کا پیغام اور سرگذشت اتمام حجت پوری وضاحت اور براہین کی اطلاع کے ساتھ پہنچ گئے تھے، اور آپ نے ان علاقوں کے سربراہوں کو خطوط لکھ کر انھیں براہ راست مخاطب بنا کر معاملہ اور بھی واضح کر دیا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

قانون اتمام حجت اور ارتداد کی سزا

ارتداد کی سزا کو بھی قانون اتمام حجت کے تناظر ہی میں سمجھا جانا چاہیے۔ ارتداد کی سزا کا تعلق عقیدے سے ہے، اور عقیدہ دل کا معاملہ ہے اور دل کی حالت پر اطلاع خدا کے سوا کسی کو نہیں اور خدا کی طرف سے اس دنیا میں اس کی اطلاع پانا رسول کے علاوہ کسی اور کے لیے ممکن نہیں ہے۔ عہد رسالت میں کفر وشرک کو خدا کی طرف سے اس دنیا میں اس لیے سزا ملی تھی کہ رسول کے ذریعے سے ان پر اتمام حجت ہوا تھا اور سزا یافتہ قوم کے پاس انکار کا کوئی عذر نہیں رہ گیا تھا، بعینہٖ یہی معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ان مرتدین پر بھی لاگو ہوا تھا جو رسول کے اتمام حجت کے بعد، ایمان لا کر دوبارہ کفر وشرک کا ارتکاب کر بیٹھے تھے، چنانچہ انھیں بھی کفر وشرک کی وہی سزا ملی جو اس وقت کے کفار ومشرکین کے لیے مقرر کی گئی تھی، یعنی موت۔ جس طرح عہد رسالت کے بعد کفر وشرک پر قتل ومحکومی کی سزا کا

اطلاق اور تعمیم درست نہیں، اسی طرح ارتداد پر بھی اس سزا کا عمومی نفاذ درست نہ ہوگا۔ رسول اللہ کا ارشاد 'مَنْ بَدَّلَ دِینَہٗ فَاقْتُلُوْہُ' (جو اپنا دین بدلے اسے قتل کر دو) بھی اسی تناظر میں درست معلوم ہوتا ہے۔

جس طرح آج یہ طے نہیں ہوسکتا کہ کس غیر مسلم پر اتمام حجت ہو گیا ہے یا نہیں، کون جان بوجھ کر منکر ہے اور کون ناسمجھی کی وجہ سے انکار کر رہا ہے، اسی طرح یہ معلوم کرنے کا بھی کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ مرتد ہونے والے کے پاس اسلام چھوڑ دینے کا کوئی عذر محض بہانہ ہے یا وہ واقعی اسے کوئی عقلی تقاضا سمجھ رہا ہے۔

موت کو ارتداد کی عام سزا قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مرتد اگر موت کی سزا کے ڈر سے بظاہر مسلمان بن کر رہنے لگے تو قانون و معاشرہ اسے قبول کر لے، لیکن اگر دیانت داری سے اپنے منحرف عقیدے کا اظہار کر دے تو قتل کی سزا کا مستحق قرار پائے، یعنی منافق مسلم قبول ہوگا اور کھلم کھلا منکر نا قابلِ قبول۔ ایک منافق مسلم ایک مسلم سماج کے لیے زیادہ نقصان دہ ہوسکتا ہے یا ایک علانیہ غیر مسلم؟ عقیدہ دل کا معاملہ ہے، اس پر کوئی قانونی پابندی لگانا عقل و فہم کی رو سے بھی کوئی معقول بات معلوم نہیں ہوتی۔ آج کے مرتدین یا متشککین سے صرف مکالمہ ہی ہوسکتا ہے۔ خاص طور پر دور جدید کے فلسفوں اور اہل مذہب کی طرف سے مذہب کے نام پر شدید بداخلاقی، انتہا پسندانہ رویوں اور الحادی افکار کے شافی جوابات دینے کی قابلیت کے فقدان کی وجہ سے یہ آنکھوں دیکھی حقیقت ہے کہ بہت سے لوگوں کے لیے دین کا تعارف ایسے ہی لوگ بن گئے ہیں اور دین سے ان کی روگردانی کا سبب بھی۔ ایسے میں مذہب بے زار طبقے کو مرتد قرار دے کر ان کی موت کے فتاویٰ صادر کرنا نہ تو دین کا تقاضا ہے اور نہ دین کی کوئی خدمت، بلکہ دین کے نام پر مزید خرابی پیدا کرنے کا سبب ہے۔ البتہ ارتداد کو اگر منفی انداز کا پراپیگنڈا بنا لیا جائے یا دین کے معاملے میں تضحیک اور تحقیر کے رویے اپنا لیے جائیں تو اس صورت میں یہ معاملہ فساد فی الارض کے زمرے میں دیکھا جا سکتا ہے اور ایک مسلم حکومت اس کو اسی جرم کے تناظر میں برت سکتی ہے۔

یہاں یہ بھی واضح ہو جانا چاہیے کہ مذکورہ بالا حدیث رسول کے الفاظ (مَنْ بَدَّلَ دِینَہٗ فَاقْتُلُوْہُ، جو اپنا دین بدلے اسے قتل کر دو) میں 'مَنْ'، یعنی 'جو' کے لفظ کے لفظاً مطلق ہونے سے غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے، یعنی یہ سمجھنا کہ قیامت تک جو بھی شخص اسلام سے منحرف ہو، وہ اس سزا کا مصداق ہے، محض زبان کے عام اور معروف فہم کی بنا پر بھی درست نہیں ہے۔ منطقیانہ اصولی مباحث سے قطع نظر، اگر حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو کلام جب بھی صادر ہوتا ہے تو چاہے وہ مطلق ہی کیوں نہ ہو، اپنے عقلی مقیدات مضمر طور پر ساتھ رکھتا ہے جو بدیہی طور پر سمجھ آ جاتے ہیں۔ مثلاً اگر میں اپنے طلبہ سے یہ کہوں کہ جو طالب علم کل کلاس میں نہیں آئے گا، اسے جرمانہ ہوگا، لیکن ایک طالب علم کو کوئی

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حادثہ پیش آجاتا ہے تو کیا یہ جرمانہ اس پر بھی لاگو ہوگا؟ یقیناً نہیں۔ لیکن یہ استثنا کیسے سمجھا گیا، جب کہ الفاظ میں کوئی استثنا نہیں؟ اسی طرح اس جملے میں ''جو طالب علم'' سے مراد صرف اس کلاس کے طلبہ مراد لینے میں بھی کوئی غلط فہمی نہیں ہوتی، یعنی کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہاں ساری دنیا کے قیامت تک کے طلبہ مراد لیے جا سکتے ہیں، حالاں کہ الفاظ یہاں بھی عام ہیں۔ یہ کس بنا پر سمجھا گیا؟ زبان کے معروف فہم کے مطابق۔ گویا کلام محض منطقی اصولوں سے نہیں انسانی زبان کے معروف اسالیب اور فہم کے مطابق سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرتدین کے قتل کا یہ حکم دیا تو آپ کے سامنے وہ لوگ موجود تھے جن پر آپ نے اتمام حجت کر دیا تھا اور ان کی موت کا اعلان خدا کر چکا تھا۔ چنانچہ مطلق ہونے کے باوجود آپ کے الفاظ تخصیص کے حامل سمجھے جائیں گے۔ اس لیے یہ سمجھنا کہ ارتداد پر موت کی سزا کا یہ حکم ابدی تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک عام قانون کا بیان فرما رہے تھے، زبان کے عام اور معروف فہم اور اسلام کے بنیادی اصول 'لا إكراه في الدين' (دین میں کوئی جبر نہیں) کے خلاف ہوگا۔

مولانا مودودی نے ارتداد کے مسئلے کو بھی دین کے بارے میں اپنے خاص نقطۂ نظر، یعنی حاکمیت اسلام کے تناظر میں دیکھا ہے۔ آپ نے دین کو ریاست کے مترادف قرار دے کر ارتداد کو دین سے بغاوت اور سرکشی قرار دیا ہے کہ چونکہ بغاوت کی سزا ریاست کے قانون کے لحاظ سے بھی موت ہوتی ہے، اس لیے اسلام میں ارتداد کی سزا کا موت ہونا درست ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اس پر عرض ہے کہ ارتداد کو بغاوت سمجھنا ہی غلط ہے۔ ہم ریاست کی مثال ہی لیتے ہیں۔ ایک شخص اگر ریاست کے خلاف کھڑا ہو جائے تو یہ بغاوت ہے، لیکن اگر وہ اپنا ملک چھوڑ کر چلا جائے، مزید یہ کہ اپنی شہریت بھی ترک کر دے تو اسے باغی نہیں کہا جاتا۔ چنانچہ کوئی شخص اگر اسلام ترک کر دیتا ہے تو اس کو بغاوت نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم، ارتداد اگر اسلام کے خلاف منفی پراپیگنڈا، تضحیک و تحقیر کا ذریعہ بنا لیا گیا ہو تو وہ الگ جرم ہے۔ اسے فساد شمار کیا جا سکتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ مرتد ہونے والا دوسرے مسلمانوں کے لیے ارتداد کی دعوت بن جاتا ہے، اس لیے اس کا قتل کرنا درست ہے تو یہ بات بھی سماجی رویوں کے مطابق درست نہیں۔ کوئی مرتد اگر موت کے ڈر سے بھی اپنے ارتداد سے نہ پھرے، اپنے مزعومہ عقیدے یا نظریے پر جان دے دے، تو یہ الٹا اس کی استقامت کی دلیل بن جائے گی اور یہ دوسروں کے لیے اور بھی متاثر کن ہوگی۔

قانون اتمام حجت کی تعمیم کیوں نہیں ہو سکتی؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس طرح صحابہ نے اتمامِ حجت کے قانون کو جزیرۂ عرب سے باہر روم و ایران پر لاگو کیا،

کیا ان کے بعد آنے والے عام مسلمانوں یا خود بنی اسمٰعیل کے لیے بھی اس قانون پر عمل کرتے ہوئے غیر مسلم ریاستوں کے خلاف اقدامی جنگ کوئی مذہبی فریضہ یا داعیہ قرار پاتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اتمام حجت اپنی نوعیت میں خاص ہے، کیونکہ اس کے لیے رسول کی موجودگی میں اتمام حجت ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ اس قانون پر مرتب ہونے والے احکام بھی خاص تھے اور ان کا اطلاق بھی خاص تھا۔ ان کی عمومیت کی کوئی دلیل موجود نہیں، اس لیے اس قانون کی تعمیم نہیں ہو سکتی۔ اسی بنا پر عام مسلمان، بلکہ بنی اسمٰعیل بھی دین کے نام پر کسی دوسری ریاست کے خلاف اقدامی جہاد نہیں کر سکتے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت ہمارے لیے نمونۂ عمل کی ہے، یعنی دین کے وہ احکام جن کی نوعیت ابدی تھی، اس میں آپ کی سنت اور سیرت ہمارے لیے نمونۂ عمل ہیں۔ لیکن آپ کے ساتھ جو حالات بیتے، خدا نے جس طرح آپ کی خاص مدد فرمائی اور اپنے قانون کے مطابق غلبہ دیا، وہ ہمارے لیے سرگذشت کی حیثیت رکھتے ہیں، جس کا مقصد تذکیر اور انذار ہے، بالکل ایسے ہی جیسے دیگر رسولوں کی سرگذشت ہم قرآن میں پڑھتے ہیں، لیکن بعینہٖ اس پر عمل نہیں کر سکتے، لیکن اس سے عبرت حاصل کرتے ہیں۔

اس بات کو یوں سمجھیے کہ جس طرح آپ کسی بڑی شخصیت کی سوانح کا مطالعہ کرتے ہیں تو آپ کو اس میں اپنی زندگی کے لیے رہنمائی اور بصیرت تو مل رہی ہوتی ہے، لیکن ان تمام باتوں پر بعینہٖ عمل کرنا نہیں ہوتا۔ اسی طرح قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سرگذشت ہے۔ اس سرگذشت میں وہ ہدایات جو پیغمبروں اور ان کے ساتھیوں کو اپنے خاص حالات کے تحت ملیں، ان کا مقصد ہمارے لیے تنبیہ، تذکیر اور خدا کی نشانیوں کا سامان مہیا کرنا ہے، مثلاً کسی رسول اور اس کے ساتھیوں کی سرگذشت میں بیان کردہ حالات جیسے حالات پیش آ جائیں تو ہمیں ان جیسا رویہ اور عمل اپنانا چاہیے، ان سرگذشتوں سے عمومی احکامات کا صدور نہیں ہو رہا ہوتا۔ ہمیں ایک داستان سنائی گئی ہے، کوئی ضابطۂ عمل بیان نہیں کیا گیا۔

احکامات کی عمومیت اور خصوصیت ان کے سبب یا علت کے عام یا خاص ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مثلاً ایمان کی دعوت قبول کرنا اور خدا کی عبادت کے احکام اپنی نوعیت میں عمومیت کے حامل ہیں، کیونکہ خدا نے جن وانس کو اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے۔ لیکن اتمام حجت کا قانون اور اس پر متفرع ہونے والے احکام کی تعمیم نہیں ہو سکتی، کیونکہ اس کا سبب یا علت، یعنی رسول کی موجودگی میں اتمام حجت، خاص ہے، عام نہیں۔

دوسری بات یہ کہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ عہد رسالت کے بعد انکارِ حق پر قائم منکر اقوام پر کوئی دنیوی عذاب

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

نازل نہیں ہوا۔ ان پر بھی زوال اگر آیا ہے تو ویسے ہی جیسے کسی بھی قوم پر زوال کے عام اسباب کی بنا پر آتا ہے۔ آج کی بعض منکرین حق اقوام کو ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے علم وعقل کی بنیاد پر ترقی اور خوش حالی کی منزلوں پر منزلیں طے کرتی جاتی ہیں، اسی طرح، اب مومنین کے لیے بھی فتح ونصرت کے وعدے بھی اسی ضمانت، تیقن اور قوت کے ساتھ پورے نہیں ہوتے، جیسا کہ وہ صحابہ کے لیے پورے ہوئے تھے، مثلاً صحابہ سے کیے جانے والے یہ وعدے دیکھیے:

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ. (آل عمران ۳:۱۳۹)

”اور (جو نقصان تمھیں پہنچا ہے، اُس سے) بے حوصلہ نہ ہو اور غم نہ کرو، اگر تم مومن ہو تو غلبہ بالآخر تمھیں ہی حاصل ہو گا۔“

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ. (محمد ۴۷:۷)

”ایمان والو، اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمھاری مدد کرے گا اور (اِن دشمنوں کے مقابلے میں) تمھارے پاؤں جما دے گا۔“

ہم جانتے ہیں کہ مسلم تاریخ میں بہت سی مسلم عسکری تحریکیں اٹھیں، لیکن وہ سب شکست و ناکامی سے دوچار ہوئیں۔ ان میں سے ہر تحریک، قرآن مجید میں بیان کردہ صحابہ کو دی جانے والی فتح ونصرت کی بشارتوں کو اپنے لیے بھی باور کرتی رہی، لیکن ان کو کامیابی نہیں ملی۔ ان میں سے بہت سی ایسی تحریکیں تھیں، جن کے اخلاص، تقویٰ، للہیت اور قربانیوں پر کوئی انگلی نہیں اٹھائی جا سکتی، اس کے باوجود وہ ناکام ہوئیں۔ یہ سب یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ قرآن مجید کی بیان کردہ سرگذشتوں کا مطلب یہ نہیں تھا کہ قانونِ اتمامِ حجت اور اس کے تناظر میں فتح ونصرت اور عذاب وعقاب کے وعدے اور وعیدیں قیامت تک کے مسلمانوں اور ان کے دشمنوں کے لیے کوئی ضابطہ قرار پائے ہیں۔ قرآنی نصوص کا درست فہم اور تاریخی حقائق سب اس غلط فہمی کے ابطال میں ناقابل تردید برہان کی صورت میں ہمارے سامنے کھڑے ہیں۔

قانون اتمام حجت کو تسلیم نہ کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے؟

اگر یہ سب ایسا نہیں، جیسا کہ قانون اتمام حجت کی روشنی میں ہم نے بیان کیا ہے تو قرآن مجید کے بہت سے احکامات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی سیاسی اور جنگی حکمت عملی پر بہت سے سوال کھڑے ہو جاتے ہیں جن کا کوئی شافی جواب دینا ممکن نظر نہیں آتا۔ مثلاً:

i۔تمام رسولوں کے منکرین اسی دنیا میں ختم کر دیے گئے۔اس استیصال کو خدا نے اپنی سنت کہا ہے،اور کہا ہے کہ خدا کی یہ سنت تبدیل نہیں ہوسکتی۔پھر پورے قرآن میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منکرین کو اسی دنیوی عذاب سے بار بار ڈرایا گیا۔پھر صحابہ سے کہا گیا کہ وہ عذاب تمھارے ہاتھوں سے نازل ہوگا۔اب اگر صحابہ کی تلواروں سے آنے والا عذاب وہ عذاب نہیں تھا جو رسولوں کے منکرین پر اسی دنیا میں آتا تھا تو بتایا جائے کہ خدا کی یہ غیر متبدل سنت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منکرین کے حق میں کیسے بدل گئی،وہ دنیوی عذاب ان منکرین پر کیوں نہ آیا؟

ii۔اگر صحابہ کی تلواروں سے آنے والا عذاب وہی عذاب تھا جو رسولوں کے براہ راست منکرین حق پر آتا تھا تو یہ عذاب خاص سنن الٰہیہ میں سے تھا،تو جس طرح گذشتہ دنیوی عذاب اپنے زمان و مکان کے ساتھ مخصوص تھے، یہ عذاب بھی اپنے مکان و زمان کے ساتھ مخصوص ہونا چاہیے۔لیکن اس عذاب کو بیان شریعت کس بنیاد پر سمجھ لیا گیا اور اس کی تعمیم کس دلیل سے کی گئی؟

iii۔صحابہ کس بنیاد پر عرب کے مشرکین کو اسلام اور تلوار کے علاوہ کوئی اور انتخاب نہیں دیتے تھے، جب کہ قرآن مجید کہتا ہے کہ دین میں کوئی جبر نہیں۔جو ایمان لانا چاہے، لائے، جو کافر ہونا چاہے ہو جائے۔ان کا حساب آخرت میں کیا جائے گا:

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِی الْوُجُوْهَ بِئْسَ الشَّرَابُ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا. (الکہف ۱۸:۲۹)

”اِن سے کہو، تمھارے پروردگار کی طرف سے یہی حق ہے۔سو جس کا جی چاہے، ایمان لائے اور جس کا جی چاہے، انکار کر دے۔ہم نے ظالموں کے لیے ایسی آگ تیار کر رکھی ہے جس کے سراپردے اُن کو اپنے گھیرے میں لے لیں گے۔اگر وہ پانی کے لیے فریاد کریں گے تو اُن کی فریاد رسی اُس پانی سے کی جائے گی جو پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہو گا۔ وہ چہروں کو بھون ڈالے گا۔کیا ہی برا پانی ہوگا اور کیا ہی برا ٹھکانا!“

iv۔کیا وجہ ہے کہ اہل کتاب کو تو جارحیت سے باز آ جانے پر محکومی کے ساتھ جزیرۂ عرب میں رہنے کی اجازت دے دی گئی، لیکن مشرکین عرب کو یہ انتخاب نہیں دیا گیا، ان کے لیے جزیرۂ عرب میں رہنے کی صورت میں تلوار یا اسلام کے علاوہ تیسرا انتخاب کیوں نہ تھا؟

v۔ کیا وجہ ہے کہ ایک طرف قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتا ہے کہ آپ کو ان منکرین پر داروغہ نہیں بنایا گیا کہ ان سے منوا کر ہی چھوڑیں اور دوسری طرف کہتا ہے کہ ان کفار سے اس وقت تک برابر قتال کیے جاؤ جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں اور نماز قائم کر کے اور زکوٰۃ ادا کر کے اپنے مسلمان ہونے کا ثبوت نہ دے دیں؟

vi۔ کیا وجہ تھی کہ صحابہ اس وقت بھی جنگ سے واپس نہ ہوئے جب رومی و ایرانی سرداروں نے انھیں صلح کی پیش کش کی؟ جب کہ قرآن کہتا ہے کہ اگر دشمن صلح کی طرف مائل ہوں تو ان سے صلح کر لو۔

vii۔ اگر صحابہ کی جنگ کشور کشائی یا مخالف جارح طاقتوں کی بیخ کنی کے لیے تھی تو وہ اس وقت جنگ سے کیوں رکنا چاہ رہے تھے جب جنگی تقاضوں اور جارحیت کے خاتمے کے لیے جنگ جاری رکھنا ضروری تھا، اس وقت وہ مخصوص سرحدوں تک محدود کیوں رہنا چاہ رہے تھے؟

viii۔ اگر صحابہ نے روم و ایران پر جنگی مہمات اتمامِ حجت کے قانون کے تحت نہیں کیں تو روم و ایران کے محکوموں پر وہی سزا کیوں نافذ کی گئی جو عرب کے اہل کتاب پر نافذ کی گئی؟

ix۔ قرآن مجید ایک جگہ کہتا ہے کہ کفار اگر صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی صلح کر لو، اور دوسری طرف کہتا ہے کہ کفار کے ساتھ تمام معاہدات ختم کر دو، بلکہ جنھوں نے معاہدات کے دوران کوئی خلاف ورزی نہیں کی، ان کے معاہدات کی مدت مکمل کرنے کے بعد ان سے آیندہ کے لیے کوئی معاہدہ بھی نہ کرو، اور پھر ان کے ساتھ بھی قتال کرو؟ اگر یہ کہا جائے کہ یہ مختلف حالتوں کے احکام ہیں۔ مسلمان اگر کمزور ہوں یا مسلمانوں کی سیاسی مصلحت کا تقاضا ہو تو صلح کر لی جائے، ورنہ اصل قتال ہی ہے، تو کیا وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار مکہ کے ساتھ سن ۶ ہجری میں اس وقت صلح کی جب آپ سیاسی اور عسکری لحاظ سے ان سے طاقت ور ہو چکے تھے، اور اسی وجہ سے حضرت عمر سمیت دیگر مسلمانوں کو دب کر صلح کرنا کھِل رہا تھا۔

x۔ فقہا نے کس بنا پر یہ ضروری سمجھا ہے کہ دین و ایمان کی دعوت سے پہلے کسی قوم پر جنگ مسلط نہیں کی جا سکتی؟

فقہا نہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی عسکری مہمات کے لیے، بلکہ تمام مسلمانوں کے لیے بھی اقدامی جنگوں کا جواز اسی قانون کی تعمیم کی رو سے مہیا کرتے ہیں۔ یعنی جب فقہ میں یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ صحابہ نے روم و ایران کو پہلے دعوت اسلام دی، جس کے انکار پر ان پر جنگ مسلط کر دی گئی، اور صحابہ نے کفر یا شوکت کفر توڑنے کے لیے یہ اقدام کیا تو درحقیقت یہ اتمام حجت کے قانون ہی کا بیان ہے۔ بلکہ اسی بنیاد پر ایک عام مسلم ریاست کے لیے بھی اقدامی جنگ کا جواز مہیا کیا جاتا ہے۔ ابن رشد لکھتے ہیں:

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

فَأَمَّا شَرْطُ الْحَرْبِ فَهُوَ بُلُوْغُ الدَّعْوَةِ بِاتِّفَاقٍ، أَعْنِي أَنَّهُ لَا يَجُوْزُ حِرَابَتُهُمْ حَتّٰى يَكُوْنُوْا قَدْ بَلَغَتْهُمُ الدَّعْوَةُ، وَذٰلِكَ شَيْءٌ مُجْمَعٌ عَلَيْهِ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ؛ لِقَوْلِهِ تَعَالٰى: (وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا) (الإسراء: ١٥). (بدایۃ المجتہد، ۲/۱۴۹)

''اس پر اتفاق ہے کہ جنگ کی شرط ابلاغِ دعوت ہے۔یعنی یہ دعوت جب تک ان غیر مسلموں تک پہنچ نہ جائے ان سے جنگ کرنا جائز نہیں۔اس پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اور جب تک ہم پیغمبر نہ بھیج لیں عذاب نہیں دیا کرتے۔''''

قانون اتمام حجت کو بہ نظر غائر نہ دیکھنے کی وجہ سے یہ باور کرنا پڑتا ہے کہ دین اسلام کی محض خبر پہنچا دینے سے اتمام حجت ہو جاتا ہے اور ایک مسلم ریاست کو غیر مسلموں پر جنگ مسلط کرنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ اس تعبیر کی غیر معقولیت عیاں ہے اور بڑے خلجان کا باعث بھی ہے، لیکن اس ساری صورتِ حال کو ہمارے بیان کردہ قانون اتمام حجت کی روشنی میں سمجھا جائے تو تمام اشکالات حل ہو جاتے ہیں۔ہم نے جن دلائل کی بنا پر قانون اتمام حجت بیان کیا ہے، اس کی رو سے ایسے تمام اقدامات کا جواز اور مصداق زمان و مکان کے مخصوص دائرے میں متعین ہو جاتا ہے اور یہ طے ہو جاتا ہے کہ اس قانون سے متعلق احکامات شرعی اور ابدی نوعیت کے نہیں تھے، البتہ اس سے حاصل ہونے والی عبرت عام اور ابدی ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حرف آخر

ان معروضات کی روشنی میں قانونِ اتمامِ حجت پر وارد کیے گئے اب تک کے تمام نمایاں اعتراضات اور اشکالات کے جوابات ہمارے فہم کے مطابق بہ خوبی حاصل ہو جاتے ہیں۔تاہم انسانی علم و فہم خطا سے مبرا نہیں۔ اہل علم سے گزارش ہے کہ راقم کے اس سارے بیان میں جو کمی، کوتاہی یا غلطی پائیں نشان دہی فرما کر ممنون فرمائیں۔جزاکم اللہ۔

ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی

کیا انسان اللہ کا خلیفہ ہے: ایک قرآنی مطالعہ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

یہ بات کہ انسان اللہ کا خلیفہ ہے، متعدد مفسرین نے کہی ہے۔ اور یہ انھوں نے آیت کریمہ 'اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً' (البقرہ۲: ۳۰) کی تفسیر کرتے ہوئے کہی ہے۔ آیت کا ترجمہ ہے کہ ''میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں''۔ اگرچہ اس میں یہ وضاحت نہیں کہ کس کا خلیفہ، لیکن اردو کے متعدد مترجم اس کو اللہ کا خلیفہ گردانتے ہیں اور بعض مترجم تو آگے بڑھ کر صاف صاف یہ ترجمہ کرتے ہیں کہ ''میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں''۔ مولانا احمد رضا خاں نے یہی ترجمہ آیت مذکورہ کا کیا ہے۔ تاہم ان حضرات کے ہاں یہ ایک سادہ سا خیال ہے، وہ اس سے کوئی فکری فلسفہ برآمد نہیں کرتے۔ ہاں اہل تشیع اس خیال سے اپنے مزعومہ ائمہ معصومین کی معصومیت اور عظمت پر استدلال کرتے ہیں۔ موجود دور میں مولانا مودودی اور ان کی متابعت میں سید قطب نے دین کی نئی تفہیم و تشریح کی جس کو بہت سے اہل علم نے بجا طور پر دین کی سیاسی تعبیر کہا ہے۔[1] اس سلسلہ میں مولانا مرحوم نے قرآن کی چار بنیادی اصطلاحوں میں الٰہ، دین، رب اور عبادت کی لغوی تحقیقات کے ذریعہ ان الفاظ کی نئی تشریح کی ہے اور ان کو اپنے فہم دین کہ ''حکومت الٰہیہ (اقامت دین) ہی انبیا کی بعثت کا بنیادی مقصد ہے''، کا مبنیٰ بنایا ہے۔ اسی سلسلہ میں

---

[1] مولانا علی میاں ندوی، ''عصر حاضر میں دین کی نئی تشریح پر ایک نظر'' (عربی ترجمہ التفسیر السیاسی للاسلام)؛ مولانا محمد منظور نعمانی، ''مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت اور اب میرا موقف''؛ مولانا وحید الدین خاں، ''تعبیر کی غلطی''؛ شیخ محمد سلیمان القائد، ''الخطأ فی التفسیر'' اور مولانا سلطان احمد اصلاحی، ''مسئلہ حاکمیت الٰہ کا تنقیدی جائزہ''۔ نیز جناب جاوید احمد غامدی صاحب نے بھی اپنی کئی نگارشات میں اس پر روشنی ڈالی ہے، مثلاً ملاحظہ ہو ''مقامات'': شائع کردہ المورد لاہور پاکستان۔

انھوں نے سورۃ البقرہ کی مذکورہ آیت کریمہ کی تفسیر بھی کی، جس کے مطابق ہر انسان بالفعل اللہ کا خلیفہ ہے اور جن افراد اور قوموں کے پاس اقتدار آ جاتا ہے وہ اس کے بالقوۃ خلیفہ ہوتے ہیں۔ تاہم یہ منصب اہل ایمان کا ہے کہ وہ اس کے خلیفہ بنیں اور استخلاف فی الارض کی ضروری شرائط پوری کریں تبھی ان کو امامت کبریٰ یا دنیا کا اقتدار ملے گا وغیرہ۔ اس منطق سے فرعون و نمرود اور ابوجہل اور ابولہب بھی خدا کے خلیفہ ٹھیرتے ہیں اور ان جیسے اور سرکش شیاطین بھی!

مولانا مودودی اور سید قطب کی تبعیت میں جماعت اسلامی اور اخوان المسلمون نے جو لٹریچر پیدا کیا ہے، اس میں بڑی کثرت سے اس بات کو دہرایا گیا ہے کہ ''انسان اللہ کا خلیفہ ہے، اس کے سر پر خلافت الٰہیہ کا تاج رکھا گیا ہے'' وغیرہ وغیرہ۔ ان حضرات نے اس کو ایک دینی مسلمہ اور اجماعی مسئلہ مان لیا ہے۔ اس سلسلہ میں مفسرین کی جو دوسری آرا موجود ہیں، ان کا یہ حضرات بہت سرسری ساذکر کر کے گزر جاتے ہیں۔ مزید برآں ان کے علاوہ اور علما و مصنفین کی اکثریت بھی شعوری و غیر شعوری طور پر اب اس مفروضہ کو مانتی ہے۔ اسی پس منظر میں آیتِ خلافت کے سلسلہ میں چند سطور پیش کی جا رہی ہیں۔[2]

مسئلہ اسماء وصفات الٰہیہ کا ہے جو توقیفی ہیں، ان کے بارے میں اپنے اجتہاد سے کوئی دعویٰ کر دینا صحیح رویہ نہ ہو گا۔ جتنا بڑا دعویٰ ہوتا ہے، اس کی اتنی ہی بڑی دلیل بھی ہونی چاہیے۔ اس لحاظ سے جب ہم غور کرتے ہیں کہ کیا انسان کے خلیفۃ اللہ فی الارض ہونے کی کوئی مضبوط دلیل قرآن یا سنت میں پائی جاتی ہے یا نہیں؟ تو بڑی حیرت ہوتی ہے کہ نہ قرآن میں اس دعویٰ کی کوئی دلیل ہے (نص صریح تو بالکل نہیں البتہ مذکورہ آیت کا بہت سے مفسرین کا فہم ہے، جو اجتہادی ہوتا ہے منصوص نہیں اور اس سے دلائل کی روشنی میں اختلاف کیا جا سکتا ہے) اور نہ حدیث میں اس کی کوئی دلیل ہے۔ صحیح حدیث میں تو یہ دعا بھی آئی ہے: 'اللّٰھم اخلفني في أھلي'[3] (اے اللہ، میرے غائبانہ میں

۲؎ پروفیسر صبیح الدین انصاری نے اپنی دو کتابوں: ا۔ ''کیا انسان اللہ کا خلیفہ ہے'' ۲۔ ''مولانا مودودی کا تصور خلافت، تفہیم القرآن اور تفہیمات'' کے خصوصی حوالہ سے (مکتبہ الفوزان بٹلا ہاؤس جامعہ نگر نئی دہلی) میں تفصیل سے مولانا مودودی کے تصور خلافت کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے)۔ نیز پروفیسر الطاف احمد اعظمی نے اپنی ناقدانہ کتاب: ''احیاء دین اور تین دینی جماعتیں'' میں تفصیل سے اس تصور پر نقد کیا ہے۔

۳؎ یہ ٹکڑا اس لمبی دعا کا حصہ ہے جو طائف کے دعوتی سفر سے واپسی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی۔ (تہذیب سیرۃ ابن ہشام ۹۷) اس کے علاوہ ایک نبوی دعا ان الفاظ میں آئی ہے: 'اللّٰھم أنت الصاحب في السفر والخلیفة في الأھل'، (صحیح مسلم) 'اللّٰھم أنت الصاحب في السفر والخلیفة في الأھل اللّٰھم اصحبنا في سفرنا واخلفنا

میرے گھر والوں کی نگہبانی فرمانا)۔اس حدیث سے تو مذکورہ تصورخلافت کی جڑ ہی کٹ جاتی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ تو کسی انسان کا خلیفہ ہونے سے رہا۔اس کے علاوہ ''مسند احمد'' اور دوسری کتابوں میں یہ حدیث بھی آئی ہے کہ کسی نے حضرت ابوبکر کو 'یا خلیفة اللّٰه' کہہ کر پکارا تو آپ نے اس کو ناپسند کیا اور اس کی تصحیح کرتے ہوئے کہا کہ:'لست بخليفة اللّٰه ولكني خليفة رسول اللّٰه'[4]۔

درست ہے کہ اکثر مفسرین اور علما یہ کہتے ہیں کہ انسان اللہ کا خلیفہ ہے۔تاہم یہ ان حضرات کی اپنی راے ہے۔ اس کے بالمقابل دوسری راے بھی سلف سے منقول ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان اللہ کا خلیفہ نہیں ہے، بلکہ یا تو جنوں کا خلیفہ ہے جو انسان سے پہلے دنیا میں آباد کیے گئے تھے یا ایک انسان دوسرے انسان کا اور ایک قوم دوسری قوم کی خلیفہ ہے۔امام ابن تیمیہ نے اپنے ''الفتاویٰ'' میں اس بارے میں بڑا سخت موقف اختیار کیا ہے، وہ کہتے ہیں:'من جعل له خليفة فهو مشرك به'[5] (مجموعہ الفتاویٰ ۲/۵۵۲) ''جو شخص انسان کو اللہ کا خلیفہ مانتا ہے، وہ اس کے ساتھ شرک کرتا ہے۔''

پہلی تنقیح: عربی زبان کے تمام لغات ومعاجم اس پر متفق ہیں کہ خلیفہ وہ ہے جو 'من يخلف غيره': کسی دوسرے کے بعد آئے، اس کی جگہ لے۔(مادہ خ ل ف مادہ سلف کا مقابل ہے)۔'خلف ضد القدام مثلًا يعلم ما بين أيديكم وما خلفكم وخلف ضد تقدم وسلف'[6] یہ بھی واضح رہے کہ عربی زبان کی مخصوص نزاکت اور انفرادیت یہ ہے کہ مادہ (root) کے تمام مشتقات میں اس کی اصل حقیقت کا پایا جانا ضروری ہے۔لہٰذا خلف سے جتنے مشتقات بنیں گے، ان میں اس کا بنیادی مفہوم کسی نہ کسی شکل میں موجود ہونا چاہیے۔رات ودن ایک دوسرے کے پیچھے آتے ہیں: اسی لیے قرآن ان کو کہتا ہے:'خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا'[7] 'خَلَف' (لام کے فتحہ کے ساتھ) عموماً اچھے اور 'خَلْف' (بسکون لام) برے جانشین کے لیے آتے ہیں۔برے جانشین کے لیے

في أهلنا' (الفتاویٰ الکبریٰ، ابن تیمیہ ۲/۵۵۲)۔

[4] 'عن أبي مليكه أن رجلًا قال لأبي بكر الصديق رضى اللّٰه عنه: يا خليفة اللّٰه، فقال: أنا خليفة محمد صلی اللہ علیہ وسلم وأنا راض بذالك'۔اس کے علاوہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کا اسی طرح کا ایک واقعہ پروفیسر محمد صبیح الدین انصاری نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے، ملاحظہ ہو: کیا انسان اللہ کا خلیفہ ہے ص ۸۷۔

[5] شیخ الاسلام ابن تیمیہ، الفتاویٰ الکبریٰ، ۲/۵۵۳۔

[6] ص ۱۵۵، المفردات فی غریب القرآن للراغب الاصفہانی دار المعرفہ بیروت۔

[7] الفرقان ۲۵: ۶۲۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

'خَلْف' کا استعمال قرآن نے کیا ہے۔ 'فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا'[8]۔

دوسری تنقیح: نائب اور جانشین، دونوں اپنے متبادر معنوں میں ایک نہیں ہیں، بلکہ الگ الگ معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ جانشینی میں کسی کے بعد کا یا عدم موجودگی کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اور بَعدیت اور عدم موجودگی کا مفہوم جانشینی سے اس طرح لپٹا ہوا ہے کہ اس سے اس کو الگ نہیں کیا جا سکتا ہے، کہ اس کے بغیر جانشینی کا تصور ہی بے معنی ہے۔ اپنی زندگی میں کوئی صاحب امر کسی کو اپنا جانشین نامزد کرتا یا مقرر کر دیتا ہے تو اس کو ولی العہد کہتے ہیں۔ اردو کے بعض مفسرین نے بھی اسی معنی میں آدم علیہ السلام کو اللہ کا خلیفہ یا ولی العہد بتایا ہے[9]۔ جہاں تک نیابت کی بات ہے تو اس میں عدم موجودگی یا بَعدیت کا ہونا ضروری نہیں، بلکہ کسی کی زندگی میں بھی اس کا نائب ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے، نائب السلطنت، نائب صدر، نائب مدیر وغیرہ اسی لحاظ سے بولے اور استعمال کیے جاتے ہیں۔ یعنی نیابت جانشینی سے کم درجہ کی چیز ہے، نیابت میں آدمی اپنے بعض اختیارات نائب کو دے دیتا ہے، جب کہ جانشینی میں منوب عنہ کے اصل اختیارات جانشین کو مل جاتے ہیں۔ ان دونوں ہی معنوں میں اللہ تعالیٰ پر اس کا اطلاق درست نہ ہوگا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ مولانا مودودی، سید قطب اور مولانا امین اصلاحی وغیرہ نے انسان کو اللہ کا خلیفہ قرار دینے کی توجیہ یہی بیان کی ہے کہ اللہ نے انسان کو آزمانے کے لیے اس کو کچھ اختیارات دیے ہیں۔ لیکن یہ حضرات یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ کون سے خدائی اختیارات انسان کو دیے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا کوئی اختیار کسی انسان کو نہیں دیا، بلکہ شارع تک بھی کسی نبی کو نہیں بنایا۔ اللہ تعالیٰ نے تنہا زمین وآسمان اور پوری کائنات کو پیدا کیا ہے۔ ان کے پورے نظام کو وہ تنہا چلا رہا ہے۔ وہی ہوائیں چلاتا ہے، بارشیں برساتا ہے، روزی دیتا ہے، وہی مارتا ہے، جِلاتا ہے، وہی بیماری وشفا دیتا ہے وغیرہ۔ کیا کوئی انسان ان چیزوں میں اللہ کا شریک ہو سکتا ہے! یقیناً اللہ نے کائنات کو انسان کے لیے مسخر کیا ہے اور کائنات کی بہت ساری اشیا انسان کی خدمت کرتی ہیں۔ اور انسان اپنی قوت عقلی سے کام لے کر ان کو مسخر کرتا چلا جا رہا ہے۔ دراصل ان حضرات کو اسی تسخیر کائنات اور انسان کی متمدن زندگی اور انسان کی زندگی کے امور کی تنظیم سے اشتباہ لگا ہے، حالاں کہ امور زندگی کی تنظیم کے لیے اللہ تعالیٰ کو کسی کو اپنا خلیفہ بنانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے لیے صرف عقل سے کام لینا اور تمدن کا شعور ہونا کافی ہے جو انسان کے اندر بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔

۸؎ مریم ۱۹: ۵۹۔

۹؎ ملاحظہ ہو تفسیر عثمانی بر ترجمہ شیخ الہند حاشیہ نمبر ۵ شائع کردہ سعودی عرب، البقرہ ۲: ۳۰۔

تیسری تنقیح: اب لفظ 'خلیفہ' پر غور کیجیے۔ اس کے اصل اور متبادر معنی جانشین کے ہیں، نائب کے معنوں میں اس کا استعمال کم ہوتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ مجازاً خلیفہ کو نائب کے معنی میں بھی استعمال کر لیا جاتا ہے۔ امام ابوجعفر طبری اور راغب اصفہانی اور ان کی متابعت میں بہت سارے مفسرین نے نائب کے معنی لیے ضرور ہیں، مگر امام ابوجعفر طبری یا راغب اصفہانی لغت، قرآن و حدیث سے اس کی کوئی دلیل نہیں دیتے، بلکہ اپنے قیاس سے یہ کہتے ہیں کہ انسان کو خلیفۃ اللہ اس کی تشریف و اعزاز کے لیے کہا گیا ہے۔ راغب اصفہانی کہتے ہیں[10]: 'و الخلافة النيابة عن الغير إما لغيبة المنوب عنه وإما لموته وإما لعجزه وإما لتشريف المستخلف وعلى هذا الوجه الأخير استخلف الله أولياء ه في الأرض، قال تعالى: هُوَ الَّذِيُ جَعَلَكُمُ خَلَائِفَ فِي الْاَرُضِ'۔ خلافت غیر کی نیابت کو کہتے ہیں، یا تو اس وجہ سے کہ منوب عنہ غائب ہے یا مر گیا ہے یا وہ عاجز ہو گیا ہے اور یا جس کو خلیفہ بنایا جا رہا ہے، اس کو عزت دینا مقصود ہے، اور اسی آخری معنی میں اللہ نے زمین میں اپنے اولیا کو خلیفہ بنایا ہے جیسا کہ فرمایا: اسی نے تم کو زمین میں جانشین بنایا۔

عام معنوں میں نیابت یہ ہے کہ بادشاہ، صاحب امر یا ذمہ دار یا عام آدمی بھی اپنے کام میں کسی دوسرے کو اپنا نائب، وکیل یا مختار بنا دے اپنے اختیارات اور مناصب میں سے کچھ اسے تفویض کر دے۔ اور جانشینی یہ ہے کہ جانشین کو اپنے منوب عنہ کے اختیارات مل جائیں۔ ظاہر ہے کہ یہ چیزیں مخلوق کے مابین تو متصور اور معمول بہ ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے بارے میں تو ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ سوال یہ ہے کہ کیا آدم یا بنی آدم کو ولی عہد مقرر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ (نعوذ باللہ) کہیں چلا گیا کہ آدم یا بنی آدم اب اس کے جانشین ہو گئے؟ یا اللہ نے انسان کو 'اپنا کوئی عہدہ یا اختیار' دے دیا ہے کہ انسان کو اس کا نائب کہا جا سکے؟ اس لحاظ سے یہاں خلیفہ کے معنی جانشین یا نائب، دونوں ہی لینا عقلاً محال اور غلط ہے۔ کسی منطق کے زور پر اسے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ انسان کو اللہ کا خلیفہ بتانے والے یہ معنی مراد نہیں لیتے جو آپ بتا رہے ہیں، میں کہوں گا کہ ممکن ہے کہ واقعی میں ایسا ہی ہو، تاہم جب کسی کو کسی کا جانشین یا نائب قرار دیں گے تو اس کا متبادر مفہوم یہی نکلے گا جس سے ہم نے اوپر بحث کی ہے۔ انسانی ذہن سب سے پہلے متبادر معنی و مفہوم ہی کی طرف دوڑتا ہے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ کے لیے ایسے الفاظ و اصطلاحات بولے ہی کیوں جائیں جن سے اشتباہ پیدا ہوتا ہو؟

انسانوں کو اللہ کا خلیفہ ماننے کی بات اتنی سادہ ہے بھی نہیں، بلکہ اس کی فلسفیانہ اساس اگر ڈھونڈی جائے تو اس

۱۰؎ المفردات فی غریب القرآن للراغب الاصفہانی دار المعرفہ ص ۱۵۶۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

کے ڈانڈے تصوف کی اس روایت میں مل جاتے ہیں جس کے مطابق انسان اپنی صورت وحقیقت میں خدا کی ذات کا پرتو ہے، بلکہ بعض تو صاف صاف کہتے ہیں کہ انسان اللہ تعالیٰ کے وجود کا ہی ایک ٹکڑا ہے (معاذ اللہ) اور بالآخر اسی میں مل جائے گا۔ مختلف فلسفوں میں اس فکر کو حلول اور اتحاد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وجودی فلسفۂ تصوف جس کو بہت سے صوفیا تصوف کے مغز اور روح سے تعبیر کرتے ہیں، اس کے سوا اور کیا ہے[11]؟

انسان اللہ کا خلیفہ ہے، اس تصور کو پھیلانے میں بھی سب سے زیادہ ہاتھ متصوفین ہی کا رہا ہے۔

کوئی کہہ سکتا ہے کہ اکثر مفسرین مذکورہ آیت کریمہ کا یہی معنی لیتے آرہے ہیں۔ میں عرض کروں گا کہ یقیناً ایسا ہی ہے، لیکن ضروری تو نہیں جو چیز مشہور ہو جائے، وہ صحیح ہو اور واقع کے مطابق بھی۔ کتنے ہی مشہور واقعات اسرائیلی روایات یا ضعیف حدیثوں کی وجہ سے مشہور ہو گئے ہیں اور آج تحقیق سے ان کا غلط ہونا ثابت ہو چکا ہے۔ سوال کیا جا سکتا ہے کہ پھر انسان کی حیثیت دنیا میں کیا ہے۔ خاک سار عرض کرے گا کہ قرآن وسنت سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ انسان اللہ کی مخلوق ہے، اس کا عبد ہے اور اس کا عبد ہونا ہی معراج انسانیت ہے۔ اللہ نے اُسے بہت اہتمام سے پیدا فرمایا جس کو: 'خَلَقْتُ بِيَدَيَّ'[12] سے تعبیر فرمایا، اسے عقل وشعور دیا، علم الاسماء سے نوازا اور فرشتوں کا مسجود بنایا۔ اسے نیکی وبدی کے راستے دکھائے: 'وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ' (البلد ۹۰: ۱۰)، اللہ نے اپنی بہت سی مخلوقات پر اُسے شرف و عظمت دی ہے۔ فرمایا: 'وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ ... وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا'[13] لیکن انسان کو عقل وشعور اور آزادی عمل جو دی گئی ہے یا کائنات کی بہت سی اشیا اس کے لیے مسخر کی گئی ہیں یا اور نعمتیں انسان کو دی گئی ہیں، وہ بربنائے نیابت الٰہیہ نہیں، بربنائے امتحان دی گئی ہیں: 'لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا'[14]۔ اس لحاظ سے انسان کی حیثیت خلیفۃ اللہ کی نہیں محکوم و مامور کی ہے۔ اللہ کے احکام کے مطابق ہی اس کو اپنے معاملات دنیا کی تنظیم کرنی چاہیے۔ تاہم یہ تنظیم امر یا حکومت خلافت کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس وجہ سے ہے کہ انسان مدنی الطبع ہے، کیونکہ تنظیم امر اور انسان کی انسان پر حکومت کو بربنائے خلافت مان لیا جائے تو ایسی حکومت و تنظیم امور تو دوسری مخلوقات

---

۱۱ دیکھیے: ''وحدت الوجود ایک غیر اسلامی نظریہ''، پروفیسر الطاف احمد اعظمی۔

۱۲ ملاحظہ ہو سورۂ ص ۳۸: ۷۵۔ اس کے علاوہ تکریم بنی آدم کا ذکر بنی اسرائیل (۱۷: ۷۰) میں بھی کیا گیا ہے: 'وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ ... وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا'۔

۱۳ بنی اسرائیل ۱۷: ۷۰۔

۱۴ الملک ۶۷: ۲۔

میں بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً چیونٹیوں میں دقیق تنظیمِ امر پائی جاتی ہے تو کیا ان کو بھی اللہ کا خلیفہ مانا جائے گا؟

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ یہ نظریہ جو بہت سارے مفسرین کرام اور علما نے اختیار کیا ہے کہ انسان اللہ کا خلیفہ ہے، کیا خود قرآن وحدیث سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے یا نہیں۔ صحیح یا غلط اس نظریہ کا ماخذ بالعموم آیت کریمہ: 'اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً' (البقرہ۲: ۳۰) کو بنایا جاتا ہے۔ سورۂ بقرہ مدنی ہے، اس سے قبل بھی مکی آیتوں میں اس لفظ کا یا اس کے مشتقات کا تذکرہ آ چکا ہے۔ چونکہ تفسیر کا مسلمہ اصول ہے کہ 'القرآن یفسر بعضه بعضًا' (قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی تفسیر کرتا ہے) تمام مفسرین مانتے ہیں کہ قرآن کا مفہوم متعین کرنے کا سب سے اشرف ترین ذریعہ قرآن ہے۔ ابن کثیر لکھتے ہیں: 'فإن قال قائل: فما أحسن طرق التفسير؟ فالجواب: إن أصح الطريق في ذلك أن يفسر القرآن بالقرآن فما أجمل في مكان فإنه بسطه في موضوع آخر'۔[۱۵]

لہٰذا مذکورہ ارشاد الٰہی کے صحیح مفہوم تک پہنچنے کے لیے ان مکی سورتوں کو سامنے رکھنا ضروری ہے جن میں خلافت یا استخلاف کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اور ان کا سیاق وسباق خود بتا دے رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کس کس کو خلیفہ بنایا اور کس کس کا بنایا۔ یہ آیات کل ۱۲ ہیں اور سورۂ نور کی آیت استخلاف کو چھوڑ کر باقی سب مکی سورتوں میں آئی ہیں۔ واضح رہے کہ خلف اور اس کے مشتقات کا استعمال درج ذیل آیتوں کے علاوہ بھی متعدد مقامات پر ہوا ہے۔ ان آیات کے ترجمے ہم نے قصداً انھی مترجمین ومفسرین کے لیے ہیں جو انسان کو اللہ کا خلیفہ مانتے ہیں، تاہم ذیل کی آیات میں کوئی بھی خلیفہ، خلافت اور استخلاف کا ترجمہ اس نظریہ کے تحت نہیں کرتا، بلکہ سب یہی بات کہتے ہیں کہ ایک قوم کی جگہ دوسری قوم کو اس کی جانشین بنا دیا۔ ملاحظہ ہو:

۱۔ حضرت صالح علیہ السلام اپنی قوم سے کہتے ہیں: 'وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ' (الاعراف مکیہ۷: ۷۴) ''اور وہ وقت یاد کرو کہ خدا نے تمھیں قوم عاد کے بعد اُس کا جانشین بنایا'' (ترجمہ ابوالکلام آزاد)۔ 'خلفاء' 'خلیفہ' کی جمع ہے۔

۲۔ حضرت ہود علیہ السلام اپنی قوم سے فرماتے ہیں: 'وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ' (الاعراف مکیہ۷: ۶۹) ''خدا کا یہ احسان یاد کرو کہ اپنی قوم نوح کے بعد تمھیں اس کا جانشین بنایا'' (ترجمہ ابوالکلام آزاد)۔

۳۔ ایک اور جگہ ہود علیہ السلام اپنی قوم سے کہتے ہیں: 'وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ' (ہود مکیہ۱۱: ۵۷) ''مجھے تو یہ نظر آ رہا ہے کہ میرا پروردگار کسی دوسرے گروہ کو تمھاری جگہ دے دے گا'' (ترجمۂ مذکور)۔

۱۵؎ تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر، الجزء الاول، مکتبۃ التجاریۃ مصر، ص۳۔

۴۔حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے ان کی تکذیب کی ،اس پر عذاب آیا،اس بارے میں فرمایا:'فَنَجَّیۡنٰهُ وَمَنۡ مَّعَهٗ فِی الۡفُلۡكِ وَجَعَلۡنٰهُمۡ خَلٰٓئِفَ' (یونس مکیہ۱۰:۷۳) ''پس ہم نے اُسے (نوح کو) اوران لوگوں کو جواس کے ساتھ کشتی میں سوار تھے (طوفان) سے بچایا اورغرق شدہ قوم کا جانشین بنایا'' (ترجمۂ مذکور)۔

۵۔حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ 'عَسٰی رَبُّكُمۡ اَنۡ یُّهۡلِكَ عَدُوَّكُمۡ وَیَسۡتَخۡلِفَكُمۡ فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرَ كَیۡفَ تَعۡمَلُوۡنَ' (الاعراف مکیہ۷:۱۲۹) ''قریب ہے کہ تمھارا پروردگار تمھارے دشمن کو ہلاک کردے اور تمھیں ملک میں اس کا جانشین بنائے پھر دیکھے (اس جانشینی کے بعد) تمھارے کام کیسے ہوتے ہیں'' (ترجمۂ مذکور)۔

۶۔عہدنبوی کے لوگوں سے خطاب ہوا:'هُوَ الَّذِیۡ جَعَلَكُمۡ خَلٰٓئِفَ فِی الۡاَرۡضِ' (فاطر مکیہ۳۵:۳۹) ''وہی ہے جس نے تم کو زمین میں آباد کیا'' (ترجمۂ مولانا محمد جونا گڑھی)۔ ''وہی ہے جس نے تم کو زمین میں قائم مقام کیا'' (ترجمہ شیخ الہند)۔حاشیہ میں مولانا شبیر احمد عثمانی نے وضاحت کی ہے:یعنی اگلی امتوں کی جگہ تم کو زمین میں آباد کیا اوران کے بعد ریاست دی۔

۷۔'وَیَجۡعَلُكُمۡ خُلَفَآءَ الۡاَرۡضِ' (النمل مکیہ۲۷:۶۲) ''اور کرتا ہے تم کو نائب اگلوں کا زمین پر'' (ترجمہ شیخ الہند)۔

۸۔'وَهُوَ الَّذِیۡ جَعَلَكُمۡ خَلٰٓئِفَ الۡاَرۡضِ' (الانعام مکیہ۶:۱۶۵) ''اوروہی ہے جس نے تمھیں (ایک دوسرے کا) زمین میں جانشین بنایا'' (ترجمۂ آزاد)۔

۹۔'ثُمَّ جَعَلۡنٰكُمۡ خَلٰٓئِفَ فِی الۡاَرۡضِ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ لِنَنۡظُرَ كَیۡفَ تَعۡمَلُوۡنَ' (یونس مکیہ۱۰:۱۴) ''پھر ان امتوں کے بعد ہم نے تمھیں ان کا جانشین بنایا تاکہ دیکھیں کہ تمھارے کام کیسے ہوتے ہیں'' (ترجمۂ مذکور)۔

۱۰۔'اِنۡ یَّشَاۡ یُذۡهِبۡكُمۡ وَیَسۡتَخۡلِفۡ مِنۡۢ بَعۡدِكُمۡ مَّا یَشَآءُ كَمَآ اَنۡشَاَكُمۡ مِّنۡ ذُرِّیَّةِ قَوۡمٍ اٰخَرِیۡنَ' (الانعام مکیہ۶:۱۳۳) ''اگر وہ چاہے تو تمھیں ہٹا دے اور تمھارے بعد جس گروہ کو چاہے تمھارا جانشین بنادے جس طرح ایک دوسرے گروہ کی نسل سے تمھیں اٹھا کھڑا کیا ہے''۔

۱۱۔'وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسۡتَخۡلِفَنَّهُمۡ فِی الۡاَرۡضِ كَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ' (النور مدنی۲۴:۵۵)۔مولانا آزاد نے اس آیت کا ترجمہ کیا ہے:''جو لوگ تم میں ایمان لائے ہیں اوران کے عمل بھی اچھے ہیں ان سے اللہ کا وعدہ پورا ہوا کہ زمین کی خلافت (یعنی اقتدار) انھیں عطا فرمائے گا اُسی طرح جس طرح ان لوگوں کو دے چکا ہے جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں''۔مولانا صلاح الدین یوسف نے اس آیت

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کی تفسیر میں استخلاف سے مراد وہ غلبہ واقتدار لیا ہے جو خلافت راشدہ کے زمانہ اور مابعد میں مسلمانوں کو دوسری قوموں پر ملا ہے (ملاحظہ ہو: ترجمہ مولانا محمد جونا گڑھی وتفسیر صلاح الدین یوسف شائع کردہ سعودی عرب)۔

۱۲۔ یہ تو قوموں کی بات ہوئی کہ ایک قوم یا گروہ کے بعد کسی دوسری قوم یا گروہ نے اُس کی جگہ لی۔ اس کے علاوہ مخصوص اشخاص وافراد کا جہاں تک تعلق ہے تو غالباً قرآن میں صرف حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں واضح طور پر آیا ہے کہ ان کو ''زمین میں خلافت دی گئی'' فرمایا: 'یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِی الْاَرْضِ' (ص مکیہ ۳۸: ۲۶)۔

واضح رہے کہ لفظ 'خلیفہ' بعینہٖ قرآن میں انھی دو جگہوں میں آیا ہے، ایک سورۂ بقرہ میں اور ایک یہاں، یعنی سورۂ ص میں۔ یہاں سوال یہ ہوگا کہ حضرت داؤد کو کس کا خلیفہ بنایا گیا تو علامہ شوکانی نے اس کا جواب یہ دیا ہے: أي و قلنا له (یاداؤد إنا) استخلفناك على الأرض أو جعلناك خليفة لمن بعدك من الأنبياء لتأمر بالمعروف وتنهى عن المنكر[16]۔ یعنی ہم نے ان سے کہا کہ اے داؤد، ہم نے تم کو زمین پر خلافت دی یا یہ مطلب ہے کہ ہم نے تم کو تم سے پہلے کے انبیا کا خلیفہ بنایا امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے لیے۔

یہ بارہ آیتیں ہیں جو خلیفہ، خلافت واستخلاف کے قرآنی استعمالات کی نظیر ہیں۔ ان کے علاوہ بھی قرآن وحدیث میں بعض اور جگہوں پر بھی اس لفظ کا استعمال ہوا ہے، تاہم کہیں بھی مروجہ مفہوم مراد نہیں لیا گیا، اسی طرح ان میں سے کسی بھی آیت میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ فلاں قوم یا فلاں گروہ یا فلاں فرد کو اللہ تعالیٰ نے ''اپنا جانشین یا خلیفہ مقرر کیا ہے''۔ ان آیتوں سے بالکل واضح ہے کہ زمین میں جانشین کر دینے کا مطلب ہے: ''کسی قوم یا فرد کو کسی پہلی اور سابق قوم کی جگہ آباد کر دینا یا کسی پہلی قوم یا سابق گروہ سے اقتدار لے کر دوسری قوم کو دے دینا''۔ لہٰذا آیت: 'اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِيْفَةً' میں بھی زمین کی خلافت سے مراد یہی جانشینی ہونی چاہیے اور زمین کے حوالہ سے خلافت یا جانشینی کا یہی مفہوم قرین قیاس لگتا ہے، کیونکہ قرآن میں زمین کی خلافت کا ہی ذکر ہے عرش کی خلافت کا نہیں، اگر عرش کی خلافت کا ذکر ہوتا تو رائج ''خلافت الٰہیہ'' کے مفہوم کی گنجایش نکل سکتی تھی۔

مذکورہ بارہ آیات کریمہ کی روشنی میں ہی سورۂ بقرہ (مدنیہ) کی آیت خلافت 'وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِيْفَةً' کا مفہوم سمجھا جاسکتا ہے، چنانچہ کئی مفسرین کرام نے بھی یہی معنی لیا ہے، امام ابن کثیر کہتے ہیں:

۱۶؎ فتح القدیر فی تفسیر القرآن العزیز، المجلد الرابع، مکتبہ المعارف، الریاض، ص ۴۲۹۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً أي قومًا یخلف بعضهم بعضًا قرنًا بعد قرن و جیلًا بعد جیل کما قال تعالیٰ (هو الذی جعلکم خلائف الارض) وقال (ویجعلکم خلفاء (الارض)) وقال (ویجعلکم خلفاء الارض وقال ولو نشاء لجعلنا منکم ملائکة فی الارض یخلفون) وقال (فخلف من بعدهم خلف)۔[17]

’’میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں، یعنی ایسے لوگوں کو آباد کرنے والا ہوں جو ایک کے بعد ایک اور نسل در نسل ایک دوسرے کی جگہ لیں گے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ’’وہی ہے جس نے تم کو زمین پر اگلوں کا خلیفہ بنایا‘‘ اور فرمایا: ’’اور وہ تم کو زمین پر اگلوں کا نائب بناتا ہے‘‘ اور فرمایا: ’’اور اگر ہم چاہتے تو تم میں فرشتے بنا دیتے جو پہلوں کی جگہ لیتے‘‘ اور فرمایا: ’’ان کے بعد وہ لوگ آئے جو نا خلف ثابت ہوئے‘‘۔

یہاں یہ بھی واضح رہے کہ ابن کثیر کی اپنی رائے تو یہی ہے۔ اس کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد انھوں نے اس مسئلہ میں دوسرے مفسرین کی آرا اس سرخی کے ساتھ بیان کی ہیں: ’ذکر أقوال المفسرین ببسط ما ذکرناہ‘۔ اس میں ابن جریر طبری کا وہ قول بھی ہے جس میں انھوں نے انسان کو اللہ کا خلیفہ قرار دینے والی رائے کا ذکر کیا ہے۔ متاخرین میں علامہ شبیر احمد ازہر میرٹھی نے بھی اپنی گراں قدر تفسیر ’’مفتاح القرآن‘‘ میں اس آیت کریمہ کی یہی توضیح فرمائی ہے۔ واضح رہے کہ علامہ کی تفسیر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے تفسیری روایات کی روایتاً و درایتاً تحقیق و تنقید کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

’وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً‘: ’’اور اے نبی یہ واقعہ سن کہ تیرے رب نے جب فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں خلیفہ، یعنی جانشینی کے ساتھ آباد رہنے والی مخلوق کی حیثیت سے رکھنے والا ہوں‘‘۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے طے کر لیا ہے کہ نوع انسانی نسل در نسل زمین میں آباد رہے گی۔ یہاں ’جَاعِلٌ‘ کے معنی ہیں: رکھنے والا، ’جعل‘ کا رکھنے کے معنی میں استعمال معروف ہے۔ چنانچہ سورۂ یوسف میں ہے ’جَعَلَ السِّقَایَةَ فِیْ رَحْلِ اَخِیْهِ‘ (یوسف نے اپنے بھائی کے اسباب میں جام شاہی رکھ دیا) اور بقرینۂ سیاق یہاں ’جَاعِلٌ‘ کا مفعول اول، یعنی الانسان مقدر ہے۔...... نفیس لغوی بحث اور قرآنی شواہد کے ذکر کرنے کے بعد آگے فرماتے ہیں: ’’انسان، بشر، آدمی کی طرح خلیفہ بھی نوع بنی آدم کا لقب ہے۔ یہ لفظ اس نوع کی ایک خاص اور امتیازی صفت کو ظاہر کرتا ہے، وہ یہ کہ روئے زمین پر جتنی بھی مخلوقات محسوسہ پائی جاتی ہیں، ان میں صرف انسان ہی وہ مخلوق ہے جو جانشینی کے تسلسل کے ساتھ یہاں آباد ہے اور قیامت تک رہے گی۔ یہ جانشینی، یعنی پچھلوں کا اگلوں کی جگہ آباد اور

[17] تفسیر القرآن العظیم ابن کثیر صفحہ ۶۹ طبع المکتبۃ التجاریہ الکبریٰ مصر۔

متاخرین کا متقدمین کے مقام کو لیتے رہنا افراد کے لحاظ سے بھی ہے، دین و مذہب میں بھی ہے اور علم و ہنر میں بھی، رنگ ڈھنگ میں بھی ہے اور اخلاق و عادات میں بھی'' وغیرہ وغیرہ ...... مزید فرماتے ہیں: ''صرف انسان ہی وہ مخلوق ہے جو نسل ونسب کے بعید ترین رشتوں کو بھی ملحوظ رکھتی ہے۔ اخلاف اپنے اسلاف کی مادی املاک کے بھی وارث ہوتے ہیں اور اکثر ان کے معنوی اوصاف کے بھی حامل بنتے ہیں پس انسان ہی وہ مخلوق ہے جس میں خلافت و توارث اور جانشینی کا طریقہ فطری طور پر پایا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں اسی معنی کے لحاظ سے انسان کو 'خلیفہ' اور انسانوں کو 'خلائف' اور 'خلفاء' کہا گیا ہے۔ لیکن شروع سے آخر تک قرآن کریم میں انسان کو خلیفۃ اللہ نہیں کہا گیا حتیٰ کہ کسی نبی کے لیے بھی یہ لفظ نہیں آیا۔ داؤد علیہ السلام کے متعلق یہ ارشاد ہوا ہے: 'یا داؤد انا جعلناك خليفة في الارض' (اے داؤد علیہ السلام ہم نے تجھے اس سرزمین میں خلیفہ بنایا ہے)، یعنی سلطنت میں طالوت کا اور نبوت میں حضرت شمویل علیہ السلام کا جانشین۔ اس کا ترجمہ یہ نہیں ہے کہ ''اے داؤد ہم نے تجھے اپنا خلیفہ بنایا ہے۔'' جن مترجمین نے یہ ترجمہ کیا ہے غلط کیا ہے۔ اس میں 'اپنا' کا لفظ بالکل غلط اضافہ ہے۔ اسی طرح یہاں 'اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً' کا یہ ترجمہ بالکل غلط ہے کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں۔ ہاں اگر 'خليفتي' یا 'خليفة لي' ہوتا تو یہ ترجمہ صحیح قرار دیا جاتا'' (تفسیر مفتاح القرآن، جلد اول صفحہ ۱۱۰، علامہ شبیر احمد ازہر میرٹھی طبع مکتبہ ازہریہ میرٹھ)۔ ابن کثیر نے بھی اپنی تفسیر میں خلیفہ کا یہی مفہوم صحیح قرار دیا ہے۔ حضرت حسن بصری سے بھی امام طبری نے یہی قول نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: 'خليفة: الذين يخلف بعضهم بعضاً'۔[۱۸]

مولانا محمد جونا گڑھی نے اس آیت: 'اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً' کا ترجمہ یوں کیا ہے: ''اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں'' ...... اس کی تفسیر میں مولانا صلاح الدین یوسف یوں فرماتے ہیں[۱۹]: ''خلیفہ سے مراد ایسی قوم ہے جو ایک دوسرے کے بعد آئے گی اور یہ کہنا کہ انسان اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ اور نائب ہے غلط ہے''۔ تقریباً اسی سے ملتا جلتا مفہوم مفسر موصوف نے سورۂ یونس میں آئے فقرہ 'خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ' (۱۴) کا بیان کیا ہے۔ ''خلائف، خلیفہ کی جمع ہے، اس کے معنی ہیں گذشتہ امتوں کا جانشین یا ایک دوسرے کا جانشین''، ص ۶۴۔ راقم سطور اپنے محدود مطالعہ اور اپنی علمی بے بضاعتی کے اعتراف کے باوجود یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا کہ خلیفہ اور خلافت کے سلسلہ میں مذکورہ بالا تین مفسرین کرام کا مفہوم ہی بے غبار اور قرآن و

۱۸؎ طبری بحوالہ تفسیر مفتاح القرآن جلد اول صفحہ ۱۱۰۔

۱۹؎ ملاحظہ ہو: صفحہ ۷ ا ترجمہ و تفسیر مولانا جونا گڑھی شائع کردہ شاہ فہد قرآن کریم کمپلیکس۔

سنت سے زیادہ ہم آہنگ معلوم ہوتا ہے۔ خلیفہ وخلافت کے سلسلہ میں مروجہ مفہوم روح شریعت سے بعید معلوم ہوتا ہے، کیونکہ کتاب وسنت میں اس کی کوئی منصوص دلیل نہیں، جو کچھ بھی ہے، وہ مفسرین کا اپنا استدلال اور استنباط ہے۔ اور اس کی حیثیت بس ایک اجتہادی رائے کی ہوگی۔ اس کو امت کی اجماعی رائے بتانا درست نہ ہوگا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

"Note from Publisher: Al-Mawrid is the exclusive publisher of Ishraq. If anyone wishes to republish Ishraq in any format (including on any website), please contact the management of Al-Mawrid on info@al-mawrid.org. Currently, this journal or its contents can be uploaded exclusively on Al-Mawrid.org, JavedAhmadGhamidi.com and Ghamidi.net"

البیان

قرآن مجید کا ترجمہ و تفسیر

جاوید احمد غامدی

تراجم کی تاریخ کا پہلا ترجمہ قرآن جس میں ترجمے ہی سے قرآن کا نظم واضح ہو جاتا ہے اور مزید کسی شرح و وضاحت کی ضرورت نہیں رہتی۔

قیمت

7945 روپے (ہارڈ بائنڈنگ)   3500 روپے (پیپر بائنڈنگ)

المورد
Al-Mawrid

المورد
ادارہ علم و تحقیق

For ordering our books, CDs and DVDs, please send us email at

info@al-mawrid.org

www.al-mawrid.org

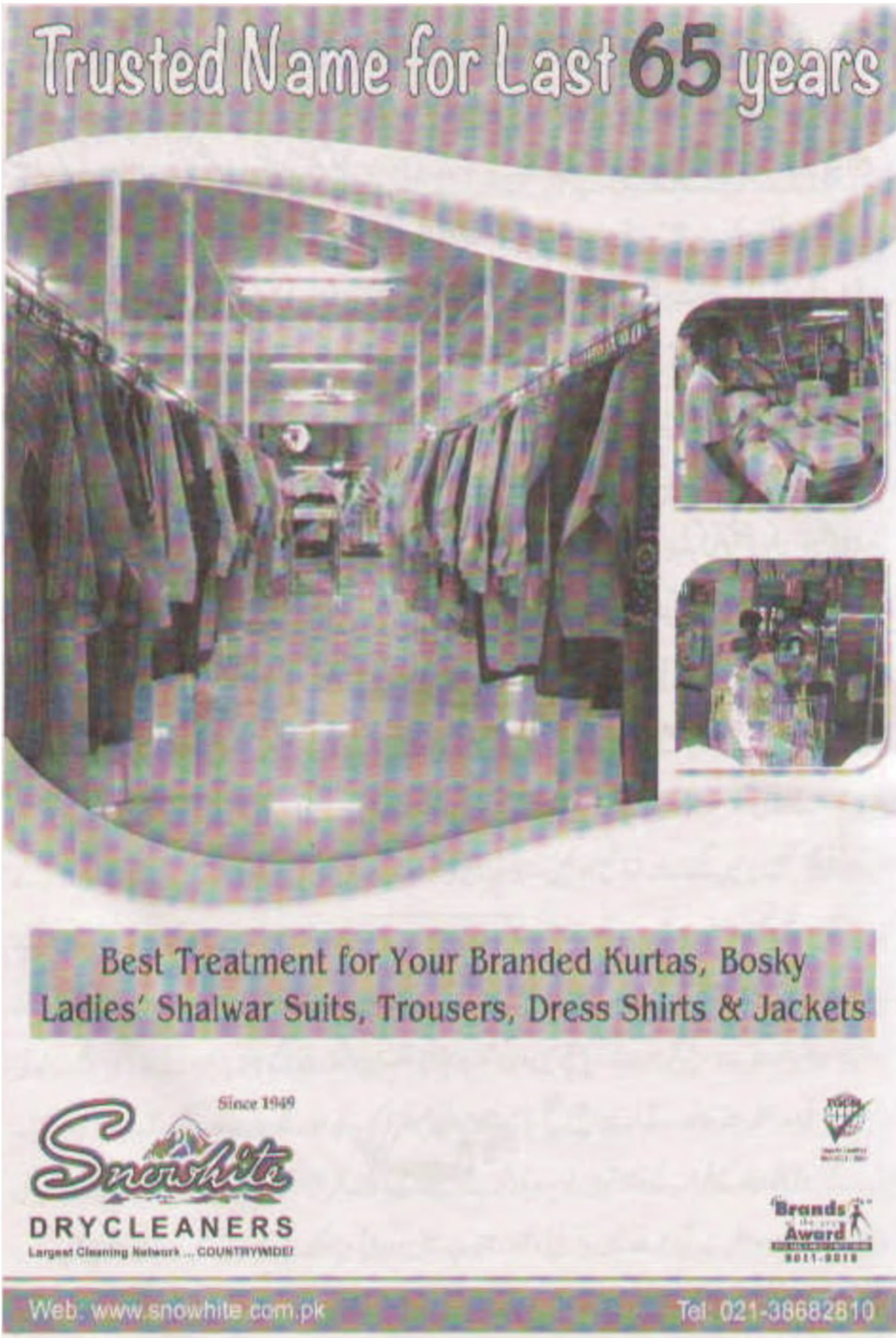
Trusted Name for Last 65 years
Best Treatment for Your Branded Kurtas, Bosky
Ladies' Shalwar Suits, Trousers, Dress Shirts & Jackets
Since 1949
Snowhite
DRYCLEANERS
Largest Cleaning Network ... COUNTRYWIDE!
Brands Award
Web: www.snowhite.com.pk
Tel: 021-38682810

Monthly
ISHRAQ
Lahore

October 2017
Vol.29 No.10
Regd. No. CPL- 183

Publisher : Javed Ahmad Ghamidi Printers : Qaumi Press, 50 Lower Mall Lahore